Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1963ء

اسلامی نظامِ مملکت کی خصوصیات

اس میں

(۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، یکساں عزت کا مستحق ہوگا (۷۰/۱۷)۔

(۲) معاشرہ میں مدارج کا معیار، کردار کی بلندی اور حسنِ عمل ہوگا (۱۹/۴۶)۔

(۳) تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی — روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ — کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی (۱۵۲/۶ : ۱۱۸/۲۰)۔

(۴) ہر ایک سے عدل ہوگا — حتیٰکہ دشمن سے بھی۔ اور جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائیگی، اسکی کمی کو پورا کیا جائیگا (۹۰/۱۶ : ۸/۵)۔

(۵) فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں تمام نوعِ انسان کی منفعت کے لئے استعمال کیا جائیگا (۲۰/۳۱ : ۱۳/۴۵)۔

(۶) ہر معاملہ کا فیصلہ، کتاب اللہ کے مطابق، باہمی مشاورت سے ہوگا اور اس سلسلے میں ملوکیت، پیشوائیت اور قارونیت کو کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی نظام کے قائم کرنے کا داعی ہے

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوع اسلام
لاہور

بدل اشتراک
ہندو پاکستان سے سالانہ ۸ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندو پاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر — (۷۵۰۰)
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۶ فروری سنہ ۱۹۶۳ نمبر ۲

فہرست مضامین

۱ — لمعات — ۲
۲ — کیا سنت قانون کا ماخذ بن سکتی ہے؟ (حدیث اور سرقہ کا نصاب) — (علامہ السید حمد الصدیق — ترجمہ سید نعیم شاہ صاحب میانوالی) — ۸
۳ — قائد اعظم کا پاکستان — (محترم پرویز صاحب) — ۱۷
۴ — روزے کے احکام — ۳۷
۵ — مجلس اقبال — ۴۲
۶ — کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں؟ — (شیخ الاسلام علامہ محمود شلتوت — ترجمہ سید نعیم شاہ صاحب میانوالی) — ۴۹
۷ — شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک — (محترم محمود الحق صاحب) — ۵۷
۸ — زندگی کا لنگر — (مولانا عبد الرب صاحب) — ۷۷
۹ — رابطہ باہمی — ۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یوں تو دنیا کی ہر قوم مستقبل کی اُمیدیں اپنے نوجوانوں سے وابستہ کرتی ہے لیکن جن قوموں کا حال مایوسی کی ملحقہ ہونی تاریکیوں کا شکار ہو چکا ہو ان کی ساری آرزوؤں اور امیدوں کا سہارا یہی تصور رہ جاتا ہے کہ ان کی ابھرتی ہوئی نسل کب عزم و ہمت سے آگے بڑھتی ہے اور اس کی کشتیٔ حیات کو مشکلات کے ہجوم سے نجات دلا کر ساحلِ مراد کا رُخ اختیار کرتی ہے۔ یہ شاہین بچے کب جوششِ کردار اور حسنِ سیرت کی تابناکیوں میں برسرِ عام نمودار ہوتے ہیں اور چاند تاروں کی طرح مستقبل کی تاریکیوں میں امیدوں کے چراغ روشن کرتے ہیں جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہماری شدتِ آرزو پہلے ہی دن سے یہی کیفیت اختیار کئے ہوئے ہے۔ ہم نے ہمیشہ اربابِ اختیار سے بے تابانہ خلوص بھری التجائیں کی ہیں کہ خدارا اس خطۂ زمین کو قرآنی انقلاب کی تجربہ گاہ بنانے کے لئے نئی نسل کی خبر لیجئے۔ ان کے دل و دماغ کو ایسی تعلیم سے منور کیجئے کہ یہ تحریکِ پاکستان کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے امین و محافظ بن سکیں۔ انہیں ایسی تربیت دیجئے کہ یہ پیکرانِ آب و گِل اس نفوذِ حیات کے چلتے جاگتے مجسمے ثابت ہوں جو تحریکِ پاکستان کا مقصود و منتہا تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے فوری طور پر اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا کہ اگر ہم نے اُبھرتی ہوئی نئی نسل کی صلاحیتوں کو صحیح تعلیم و تربیت کے ساحلوں میں محفوظ نہ رکھا تو یہ پُرسکون ندیوں کی ساحل آغوش روانی کے بجائے حدود فراموش اور قیود ناآشنا سیلاب کی تُندی اختیار کر جائیں گی اور تعمیرِ ملت کے ہر منصوبے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گی۔ ہماری یہ مخلصانہ گذارشات اربابِ اختیار کی بارگاہ میں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ اور آج اس کے تلخ نتائج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

پہلے پہلے ہمارے ہاں یہ رونا رویا جاتا تھا کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں آوارگی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان کا اخلاق تباہ ہو رہا ہے۔ پھر چیخ و پکار مچ رہی تھی کہ قوم کے یہ نوجوان طفلانہ آوارگی کی حدود سے آگے بڑھ کر مجرمانہ حرکات پر مائل ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں معزز شہریوں کا جینا حرام ہو رہا ہے۔ شریف زادیاں ان کے خوف سے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ خود ان کے ماں باپ ان کی خودسری سے نالاں ہیں۔ لیکن اب ان کی ذہنی گرم جوشیوں اور جذباتی ہنگامہ آرائیوں نے یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ آئے دن سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہڑتالوں کا رجحان سیلاب بن کر پھوٹ رہا ہے۔ مظاہروں کے ہنگامے بپا ہیں۔

طوفانی جلوس حرکت میں ہیں۔ جگہ بجگہ پولیس سے تصادم، لاٹھی چارج اور پتھراؤ کے وہ ہولناک مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ملک کی اس بدنصیبی پر دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔

کیا اس صورت حال کو سکون و اطمینان سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ کیا ملک کے ارباب فکر و نظر یہ سب کچھ خاموشی سے گوارا کر لیں گے اور فرض کی پکار انہیں اس کا کوئی خوش گوار حل تلاش کرنے پر مجبور نہیں کرے گی؟ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اگر جوش و خروش کے اس دھارے کو حسن انداز اور خوش اسلوبی سے ڈسپلن میں نہ لایا گیا اور قوم کے گرم جوش نوجوان اپنے حقیقی مقام و مقصد سے وابستہ نہ کئے جا سکے تو یہ شعلے ملک و ملت کی ہر متاع عزیز کو بھسم کر کے رکھ دیں گے اور اس کا خمیازہ ہماری کئی نسلوں تک بھگتنا پڑے گا۔

اس مقام پر ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ان ہنگامہ خیزیوں کی ذمہ داری طلباء پر زیادہ عائد ہوتی ہے یا ارباب اختیار پر۔ یہ بڑا نازک سا مسئلہ ہے۔ اور اس کا تجزیہ کوئی خوش گوار نتائج مرتب نہیں کرے گا۔ لیکن اصلاح احوال کے سلسلے میں ہم ان حقیقتوں کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ ہنگامہ خیزیوں کے یہ افسوسناک رجحانات و میلانات نوجوان طلباء کے خود پیدا کردہ ہرگز نہیں۔ ان کے اصل محرک وہ مفاد پرست اور انتشار پسند عناصر ہیں جو اپنے مشئوم مقاصد کے حصول کیلئے طلباء کے جذبات کا ناروا فائدہ اٹھانے کی نہایت مذموم حرکت پر اتر آئے ہیں۔ اور ان کے کندھوں پر بندوق رکھ کر اپنے سیاسی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ طلباء میں ایک مختصر سا گروہ موجود ہے (یا پیدا کر دیا گیا ہے) جو سیاسی طالع آزماؤں کے ایجنٹ کی حیثیت سے معصوم طلباء میں ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق، سازشوں کے جال پھیلاتا ہے۔ اور مختلف ہتھکنڈوں سے ان کے جذبات کو برانگیخت کر کے جگہ بجگہ ملک کے امن کو شعلوں کے سپرد کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک طلباء کی واضح اکثریت کا تعلق ہے، ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ فریب خوردہ یا نادانستہ آلۂ کار تو کہلا سکتے ہیں لیکن ان ہنگاموں کے حقیقی ذمہ دار ہرگز نہیں۔ اگر ان حقیقی مجرموں کا جو پس پردہ اس ڈرامہ کو چلا رہے ہیں سختی سے محاسبہ کیا جائے تو اس طوفان کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے جو نہ صرف طلباء کے مستقبل کو اپنی ہوسناکیوں کی بھینٹ چڑھا رہا ہے بلکہ ملک کے مستقبل کو بھی گوناگوں تلخیوں اور ہیجان و اضطراب سے دوچار کئے جا رہا ہے۔

صورت حال کا کڑا احتساب اس امر کی شہادت بہم پہنچائے گا کہ ان سازشی اور فتنہ پرداز عناصر میں ایک بڑی تعداد ان مقدسین کی ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت میں بدترین ذہنیت کا ثبوت دیا تھا جو ہمیشہ تقدس کے نقاب اوڑھ کر اس مملکت میں انتشار و افتراق کی آگ بھڑکاتے چلے آئے اور جنہوں نے آج بھی مذہب کے مقدس نام پر طلباء میں ایسی جمعیتیں قائم کر رکھی ہیں جو ان کی ہنگامہ خیزیوں میں روح رواں بن کر پیش پیش ہوتی ہیں۔ جب تک ان عناصر کو یہ اذن عام حاصل ہے کہ وہ اسلام کے نقاب میں معصوم طلباء کے جذبات سے کھیلتے رہیں اس وقت تک نہ یہ ہنگامے ٹھنڈے پڑ سکتے ہیں اور نہ قوم کے ان "شاہین بچوں" کو جو قوم کی امیدوں کے روشن ستارے ہیں ان ارفع و اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے صحیح تربیت دی جا سکتی ہے جن کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے، طلباء کی آوارگی و بے راہ روی اور موجودہ ہنگامہ آرائی کی بہت بڑی ذمہ داری ان ارباب اختیار پر

بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے ان نوجوانوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے کوئی امید افزا اقدام نہ کیا۔ جس صورت حال کا ہم آج ماتم کر رہے ہیں وہ ایک دو دن کی پیداوار نہیں بلکہ کئی سالوں کے اس مجرمانہ تغافل کا نتیجہ ہے جو نظام تعلیم و تربیت کی متوارث خرابیوں کا ازالہ کرنے کے سلسلہ میں روا رکھا گیا۔ اور اگر اب بھی اس پر مناسب توجہ نہ دی گئی تو اس کے تباہ کن نتائج صرف ایک نسل تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ یہ زہر نامحسوس طور پر آئندہ نسلوں تک برابر پھیلتا جائے گا۔ اور جو کانٹے اب ہمارے پاؤں کو زخمی کر رہے ہیں نہ معلوم کتنی نسلوں تک انہیں چھلنی کرتے چلے جائیں۔

اس لحاظ سے یہ درست ہے کہ صورت حال کی بنیادی ذمہ داری طلباء کے بجائے قوم کے بڑے بوڑھوں پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں جب ان لاکھوں والدین کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہڑتالوں اور مظاہروں کی بھینٹ چڑھ رہی ہے وہاں قومی خزانے کے کروڑوں روپیہ بھی ضائع ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دیا جائے۔ اور فتنہ جو عناصر کو کھل کھیلنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔

جب کیفیت یہ ہے تو پھر محافظ قانون کو آگے بڑھنا چاہیئے اور قومی معاشرہ میں جو فساد برپا ہے اس کے خاطر خواہ علاج میں اپنی ذمہ داریاں پورے طور ادا کرنی چاہئیں۔ اسے پیش نظر رکھیئے کہ ہم یہ سب کچھ ان عناصر کے متعلق کہہ رہے ہیں جو اس فساد معاشرہ کا سرچشمہ ہیں اور ان طلباء کے متعلق جو عملاً ان عناصر کے دست و بازو بن کر ان شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں ورنہ انہی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسے طلباء کی کمی نہیں جن کی شرافت، خلوص، دیانت اور جذبہ ملّی پر ہم جس قدر فخر کریں کم ہے۔

یہ ہے ہنگامی مفاسد کی روک تھام کی ہنگامی تدبیر۔ اصل مسئلہ ان کے مستقل علاج کا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت ٹھوس اور صحیح خطوط پر ہو۔ یعنی ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس زندگی کا تصور، جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا، صاف اور واضح طور پر ذہن نشین کرایا جائے۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ افراد معاشرہ کو انارکی (ANARCHY) سے محفوظ اور معاشرتی حدود کے پابند رکھنے کے دو طریق ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان پر خارج سے کچھ پابندیاں عائد کی جائیں اور انہیں طوعاً و کرہاً ان پابندیوں کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اسے کنٹرول (CONTROL) کہا جائے گا۔ اس طریق کار کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں افراد معاشرہ ان پابندیوں پر اسی وقت تک عمل کرتے ہیں جب تک کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ جوں ہی جبر کی یہ گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی ان پر عمل بھی کمزور پڑ گیا۔ اس کے برعکس دوسرا طریق ڈسپلن (DISCIPLINE) کا ہے۔ یہ جذبہ خود انسان کے اندر سے ابھرتا ہے اور وہ دل کی گہرائیوں سے پابندیوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر فرد معاشرہ علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھے کہ اس کے لئے ان پابندیوں کا احترام کیوں ضروری ہے؟ اور اس سے معاشرہ میں کیسی خوشگواریاں پیدا ہوں گی؟

ہمارے ہاں کے قدیم اور فرسودہ طرز زندگی میں بچوں کی تربیت کنٹرول کے ذریعہ ہوتی تھی۔ وہ چوپاؤں کی طرح غیر شعوری طور پر کچھ پابندیاں قبول کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ انہیں جبراً اخلاقی حدود کا پابند بنایا جاتا تھا اور اس سے کچھ واسطہ نہیں تھا کہ ان کے دل میں ان پابندیوں کی غرض و غایت کا شعور بیدار کیا جائے۔ چنانچہ جب ان پابندیوں کا منشاء و مقصود ان کی سمجھ میں نہ آتا اور جبر کی گرفت کمزور پڑ جاتی تو وہ ان بندھنوں کو توڑنے کے لئے بے تاب ہو جاتے۔ اس سے ذہنی انتشار اور انارکی (ANARCHY) برپا ہو جاتی۔

یہی کچھ پہلے ہوتا رہا اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ ارباب اختیار کے دلوں میں اگر اصلاح کا خیال ابھرا بھی تو اسی حد تک کہ انہوں نے کچھ نئی اصلاحات کے نام پر قدیم و جدید میں پیوند لگانے کی کوشش کی۔ یہ کھیل اس کم فہمی اور غلط نگہی کا نتیجہ تھا جو انتشار تو پیدا کر سکتی ہے صحیح انقلاب نہیں پیدا کر سکتی۔ ہم غلامی کے جس گھٹے گھٹے ماحول سے نجات پا کر آزادی اور حریت، خودنگری اور خودداری کی کھلی فضاؤں میں داخل ہوئے ہیں ان میں نظام کہن کی فرسودہ روایات اور بے معنی لوازمات کو قائم رکھنا قدامت پرستی کا تقاضا تو کہلا سکتا ہے حقیقت پسندی سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم صدیوں کے بعد ایک نئے اور مثالی نظام کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھے تھے۔ اسی کی بے تاب آرزوئیں تھیں جو عبدالرفیعن کی کرم گستری سے شرف ایجاب پانے کے قابل ہو گئیں۔ ورنہ "جنت فی سبیل اللہ" کے طور پر ہیں وہ خطۂ زمین حاصل ہو گیا جہاں اس نظام نو کی دلکشا اور روح نواز بساط بچھ سکے۔ اس لئے تعلیمی اصلاحات ہوں یا معاشرے کے کسی دوسرے گوشے میں اصلاح کا کوئی منصوبہ، محض قدیم و جدید میں پیوند لگا کر آپ کسی قومی مسئلے کو حل نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے آپ کو اساسی طور پر ایک نئے نظام کی تشکیل کا آغاز کرنا ہوگا۔ نظام تعلیم کے معاملہ میں بھی اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ چند اصلاحات یا جزوی تبدیلیوں سے یہ گاڑی نہیں چل سکے گی۔ اس کے لئے حصول پاکستان کے عظیم مقاصد کو پہلے خود سمجھنے کی کوشش کیجئے اور پھر اس نظام کا پورا ڈھانچہ بدل کر وہ نظام لائیے جو ہماری مملکت کے مقصود و منتہا کا آئینہ دار ہو۔

یہ مسئلہ اس قدر اہم تھا کہ ہم نے اس خطۂ زمین کے حصول کے فوراً بعد اس کی ضرورت و اہمیت محسوس کر لی تھی اور قوم کے ذہنی و فکری انتشار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔

> قوموں کی تعمیر کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ ایک تو موجودہ نسل کی صلاحیتوں کی بیداری اور دوسرے آنے والی نسل کی صحیح تربیت۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کی موجودہ نسل میں ارتقاء و انتشار کی صلاحیتیں ہی باقی نہ رہی ہوں۔ اس صورت میں ارباب فکر و نظر کی پوری توجہات آنے والی نسل پر مرکوز ہو جاتی ہیں تاکہ یہ ابھرنے والے بچے بیکراں آب و گل کے بجائے زندگی کے جیتے جاگتے مجسمے بن کر سامنے آئیں۔ صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰ نے جب بنی اسرائیل کو فرعون کے دست استبداد سے نجات دلائی تھی تو ان کے سامنے یہی مقصد جلیل و جمیل تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرعون کی انسانیت کش حکمت عملی نے کس طرح نہ صرف بنی اسرائیل کی نسل حاضر کو زندگی کی لذتوں سے بیگانہ بنا رکھا ہے بلکہ وہ ان کی آنے والی نسلوں کو بھی کس بری طرح ذبح کئے جا رہا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو غلامی کے چنگل سے نکالا تو اپنی تمام سعی و کاوش آنے والی نسل کے لئے وقف کر دی۔ نتیجہ یہ کہ جب وہ "شاہین بچے" جوان ہوئے تو انہوں نے نظام کہن کی ہر فرسودہ بساط کو الٹ کر رکھ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ محکومی اور آزادی میں فرق یہ ہوتا ہے کہ آزادی میں ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت

اپنے تصورات کے مطابق کر سکتے ہیں اور یہ چیز محکومی میں ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اس مدت میں ہم نے اپنے بچوں میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں جن سے ان کے قلب و دماغ ان سانچوں میں ڈھل جائیں جو ہمارے تصورِ حیات کا آئینہ ہیں۔ جہاں تک ہم دیکھ رہے ہیں اس سوال کا جواب نہایت مایوس کن ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اس کوتاہی کے لئے کوئی بھی وجہِ جواز ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو کارخانے کھولنے کے لئے مشینوں کی ضرورت ہے جو غیر ممالک سے منگانی پڑیں گی۔ اس لئے یہ احتیاج ہماری صنعت و حرفت کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسلحہ و آلات عسکریہ کے لئے بھی بیرونی امداد کی احتیاج ہے۔ اس لئے ہم اس باب میں بھی معذور ہیں۔ ہمیں فنی (TECHNICAL) شعبوں میں ٹریننگ کے لئے ماہرینِ فن کی ضرورت ہے جن کی ہمارے ملک میں سردست کمی ہے۔ اس لئے ہم اس باب میں معذور ہیں۔ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کی راہ میں اپنے بچوں کے لئے جدید نصابِ تعلیم تیار اور نافذ کرنے کے لئے کون سا سنگِ گراں حائل ہے جس کے لئے آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں۔

(طلوعِ اسلام جون ۱۹۴۹ء صفحہ ۹)

اس نصابِ تعلیم کی روح کیا ہو؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے بتایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ بلکہ خواندگی کو ہی تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے۔ لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہوں گی اسی قسم کی زندگی ہوگی اور جس قدر کسی کو ان اقدار سے عشق ہوگا اسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے انسان ان کے حصول اور تحفظ کے لئے سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (کہ وہ نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے۔) تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے۔ اور جس کا نتیجہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بالیدگی ([illegible]) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرے میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوش حالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھیڑیوں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا شرف یہ ہے

کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے۔ اور یہی اقدار سیرت کی بنیاد بن جاتی ہیں۔

(طلوعِ اسلام۔ اگست ۵۰ء صفحہ ۹)

ہم البتہ تاسف یہ عرض کرینگے کہ نظامِ تعلیم کی از سرِ نو ترتیب کے سلسلے میں اول تو موجودہ حکومت سے پہلے کوئی اقدام ہی نہیں ہوا۔ اور موجودہ حکومت نے اگر (سنہ ۱۹۵۹ء میں) ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا بھی تو اس کا دائرہ کار اس حد تک تنگ تھا کہ اس کی پیش کردہ سفارشات انتظامی اور فنی گوشوں میں اصلاح و ترمیم سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اور ان سفارشات نے جب عملی ضوابط کی شکل اختیار کی تو انتشار پسند عناصر نے اس سے ہڑتالوں، جلوسوں اور مظاہروں کے لئے وجہِ جواز پیدا کر لی۔ جیسا کہ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں ایک اسلامی مملکت میں تعلیم کی پوری ذمہ داری حکومت کے سر ہونی چاہیئے۔ یہی صورت ہے جس کی بناپر تو کوئی بچہ اخراجات کی کمی یا فقدان کی وجہ سے تعلیم و تربیت سے محروم رہ سکتا ہے اور نہ اس کی مخفی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ سکتی ہیں۔ اگر یہ ہو جاتا تو کم از کم طلبا کو اخراجات کے سلسلہ میں وہ شکایات پیدا نہ ہوتیں جنہیں دیگر شکایات کے ساتھ مظاہروں کی وجہِ جواز بنایا جاتا ہے۔

یہ تو تھا ارباب اختیار کی ذمہ داریوں اور نظامِ تعلیم سے متعلق۔ اب آخر میں ہم قوم کے ان شاہین بچوں سے بھی بخلوصِ قلب کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ملت کے ان جگر پاروں کو ہماری ان پُرخلوص اور بے تاب آرزوؤں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے جو ہم نے ہمیشہ ان کے حسنِ سیرت اور جوشِ کردار سے وابستہ کی ہیں۔ پاکستان کے حصول اور اس کی تعمیر کی کاوشوں میں ہم ایک لمحے کے لئے بھی کسی مرحلہ پر اس متاعِ گراں کی قدر و قیمت سے بے نیاز نہیں ہوئے۔ یہ نوجوان ہماری حرماں نصیبیوں میں امید کی کرن اور ہماری دعائے نیم شبی کا مقصود ہیں۔ ہماری شدتِ آرزو ہمیشہ اس ساعتِ سعید کے لئے وقف رہی ہے جبکہ ہم ان سلیم بیٹوں کو اپنے مطلعِ تقدیر پر ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے دیکھ لیں۔ ان امیدوں، آرزوؤں اور دعاؤں کے ساتھ ہم طلبا سے یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ان نونہالوں کے قدم غلط راہوں پر اٹھنے نہ پائیں۔ ان کے فکر و نگاہ کی تطہیر و تعمیر کا ہر مرحلہ جذباتی ہنگاموں اور انتشار پسندی کی سازشوں کا شکار نہ بننے پائے۔ ان کی تنظیمی مجالس تعمیرِ فکر کے نشیمن ثابت ہوں، ان کی ہر کاوشِ فکر و نظر ملک و ملت کے شاندار مستقبل کے لئے وقف ہو۔ ان کے افکار و کردار کی پاکیزگی سازشوں، ہنگاموں اور مظاہروں کے منفی رجحانات اور میلانات سے داغدار نہ ہونے پائے۔ خدا انہیں سیاسی طالع آزماؤں کے ناروا ہتھکنڈوں کا آلۂ کار بننے سے بچائے۔ ان کی شکایات خالص تعمیری مقاصد کی آئینہ دار ہوں۔ اور ان کے مداوا کیلئے یہ وہی راہ اختیار کریں جو امن و سلامتی کی راہ ہو۔ جو مصالحت و مفاہمت کے احساس پر مبنی ہو نہ کہ اشتعال اور منافرت کے تند جذبات پر۔ ہم جانتے ہیں کہ ان نوجوانانِ ملت میں شرافت و نجابت کے جوہر بدرجۂ اتم موجود ہیں اور ان کی صحیح نشو و نما انہیں اس مقامِ بلند پر فائز کر سکتی ہے جو ملک و ملت کے لئے باعثِ ناز و افتخار ہو اور اس کے شاندار مستقبل کی ضمانت قرار پا سکے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قومی مستقبل کے یہ نقیب اور پاسبان ہماری ان پرخلوص آرزوؤں کو اپنی بہترین توجہ کا مستحق قرار دینگے اور اپنی ذمہ داری کو بجا طور پر محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس مقام و منصب کا شایانِ شان ثابت کر دیں گے جو مورخ کا قلم انہیں عطا کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ ہمارے مستقبل کی تاریخ کا ایک اہم باب انہی کے کارہائے نمایاں سے آب و تاب حاصل کرے گا۔

ارباب اختیار کا بھی یہ فریضہ ہے کہ ابھرتی ہوئی نئی نسل کی ان بنیادی ضرورتوں کو سمجھیں جو صحیح تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اسے لاحق ہو سکتی ہیں۔ اور ان کے لئے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں بروئے کار لائیں اور اس کے ساتھ ایسا انتظام بھی کریں کہ انتشار پسند عناصر ان سادہ لوح نوجوانوں کو اپنے مقاصد کیلئے آلۂ کار نہ بنا سکیں۔

کیا سُنّت قانون کا ماخذ ہو سکتی ہے؟

حدیث اور سرقہ کا نصاب

علامہ السید احمد السقیفی
ترجمہ: سید نصیر شاہ صاحب میانوالی

(مصر کے علامہ السید احمد صبغی کی کتاب "عقوبۃ الافتراق علی امۃ الواحدۃ" کی تلخیص طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہدیۂ قارئین کی جا چکی ہے۔ ذیل میں اس کے ایک باب کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے اس سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم — جنید و شبلی و عطار ہم مست

طلوع اسلام)

حدیث کی دینی حیثیت کے متعلق ہمارے قلم سے جن حقائق کا اظہار ہوتا رہتا ہے انہیں دیکھ کر رجعت پسندانہ ذہنیتوں نے جو کچھ کہا ہے ہم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ہدایت کا آفتاب جب بھی طلوع ہوا ہے تقلید آبا کے دلفریب بندھنوں میں جکڑے ہوئے شپرہ چشموں نے ہمیشہ اسے سیاہ گیند کہا ہے۔ عرصے سے ایک جگہ پڑی ہوئی اینٹ کو ہٹایئے تو آپ دیکھیں گے کہ چھوٹے چھوٹے سفید کیڑے تیزی سے تاریک کونوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ آپ سے ڈر کر نہیں بھاگتے" بلکہ ان کی اندھیرے کی عادی آنکھیں اچانک نمودار ہونے والی روشنی کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوتی ہیں۔ پس جس طرح ان کیڑوں کو الزام دینا مناسب نہیں اسی طرح ان لوگوں کو کچھ کہنا بھی سراسر بے جا ہے جو ہمارے نظریات کی تنویر کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور جھنجھلا کر انہیں ہی تکفیر کے تیروں کا نشانہ بناتے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تو تکفیر کی توپیں ہیں نہ تفسیق کی مشین گنیں۔ ہمارے پاس صرف دلائل و شواہد ہیں۔ صرف آیات بینات ہیں جو ہم حیات چند روزہ کی آخری سانس تک، اس طائفہ مقدسین

کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ ہم یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ معاذ اللہ ہم لوگوں کو اللہ کے پیارے رسول صلعم کی ذات اقدس دائم سے دشمنی اور عداوت نہیں۔ ہم جو فخر کے ساتھ سربلند کر کے اپنے آپ کو مسلم و مومن سمجھتے ہیں کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس ہستی مقدس سے کوئی لغض رکھیں جس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن و مسلم کہلا ہی نہیں سکتا؟ اللہ کی ذات بلند و برتر ہمارے دلوں کے بھید بھی جانتی ہے اور ان لوگوں کے قلوب سے بھی واقف ہے جو ہم پر بے دلیل بہتان تراشتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ محض یہ ہے کہ اگر حدیث بھی دین کی بنیاد ہوتی تو سرورِ کائنات صلعم نے قرآن حکیم کی طرح اس کی حفاظت کا اہتمام کیا ہوتا اور اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا۔ سبھی مانتے ہیں کہ حدیث ظنی چیز ہے۔ ظنی کو حقیقی پر قاضی ٹھہرانا انصاف نہیں۔ ہم یہی کہتے ہیں کہ حدیث کو کتاب اللہ کے تابع رکھئے۔ اسے یہ مرتبہ نہ دیجئے کہ یہ کتاب اللہ کے مطلق احکام کو قید کر سکے یا منسوخ کرے یا کتاب اللہ کے عام حکم کو خاص کر دے۔

ہم ان حضرات سے افہام و تفہیم کے خواہشمند ہیں اور خصوصاً ان علماء سے جو وقتاً فوقتاً یہ نعرے لگاتے رہتے ہیں کہ اسلامی دستور وہی ہے "جو کتاب و سنت" کے مطابق ہو۔ ہم نہایت ادب سے گزارش کرتے ہیں کہ اسٹیجوں، زندہ باد کے نعروں اور پھولوں کے ہاروں کی دنیا سے نکل کر ذرا حقائق کے سنگریزوں پر قدم رکھئے اور سوچئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں کیا وہ عملاً ممکن بھی ہے؟ ہم ایک لمحہ کے لئے مان لیتے ہیں کہ اسلامی دستور وہی ہے جو کتاب و سنت پر مبنی ہو۔ مگر جب ہم ان ماخذ کی طرف رجوع پذیر ہوتے ہیں تو سب سے پہلے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سر دست ہم محض بطور مثال چوری کے نصاب پر بحث کریں گے۔

سرقہ کا نصاب

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اصولی طور پر فرمایا ہے کہ چوری کی سزا قطع ید ہے۔ اب چونکہ ان لوگوں کے قول کے مطابق احادیث کا کام یہ ہے کہ وہ نصاب متعین کریں جن سے واضح ہو کہ اس قدر قیمت کی چیز اگر چرائی جائے تو اس پر قطع ید کی سزا ہے۔ اس موضوع پر ہم مختصراً احادیث مختلفہ بیان کرتے ہیں۔

سب سے پہلے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو لیجئے جس میں انہوں نے فرمایا۔

انڈے کی چوری پر

عَنِ النَّبِیِّ صلعم قَالَ لَعَنَ اللّٰہُ السَّارِقَ یَسْرِقُ الْبَیْضَۃَ فَتُقْطَعُ یَدُہٗ وَ یَسْرِقُ الْحَبْلَ فَتُقْطَعُ یَدُہٗ۔

روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا چور پر خدا کی لعنت۔ وہ ایک بیضہ چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور ایک رسی چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔　　(متفق علیہ)

اسی روایت میں ایک انڈے اور رسی کی چوری پر قطع ید کی سزا سنائی گئی ہے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ۔

ڈھال کی قیمت والی چیز پر

کَانَ السَّارِقُ فِیْ عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلعم یُقْطَعُ فِیْ

ڈھال کی [1]

[1] بعض شارحین نے لکھا ہے کہ بیضہ سے مراد ڈھال ہے۔

ثَمَنِ الْمِجَنِّ وَلَا تُقْطَعُ فِی الشَّیْئِ التَّافِہِ ۔ (کتاب الخراج - قاضی ابو یوسف)

اس روایت میں ڈھال کی قیمت کی چیز پر قطعِ ید کی سزا کا ذکر ہے۔ اب چونکہ ڈھال کی قیمت مختلف زمانوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ طے کرنے کی کوشش کی گئی کہ ڈھال کی اصل قیمت وہی ہے جو حضورؐ کے زمانہ میں ہوگی۔ اس پر بھی اختلاف ہے کہ حضورؐ کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت کیا تھی۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل روایات کو ملاحظہ فرمایئے۔

ڈھال کی قیمت تین درہم تھی

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صلعم قطع فی مِجَنٍّ ثَمَنُہٗ ثَلٰثَۃُ دَرَاھِمَ ۔ (موطا امام مالک - باب ما یجب فیہ القطع)

رسولؐ خدا صلعم نے ایک ڈھال کی چوری میں ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی۔

حضرت ابن عمرؓ کی ایک اور روایت میں بھی ڈھال کی قیمت تین درہم ہی بتائی گئی ہے۔

(۲) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَطَعَ النَّبِیُّ صلعم یَدَ سَارِقٍ فِی مِجَنٍّ ثَمَنُہٗ ثَلٰثَۃُ دَرَاھِمَ (متفق علیہ)

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ صلعم نے ڈھال کی چوری پر ایک چور کا ہاتھ کاٹا۔ ڈھال کی قیمت تین درہم تھی۔

ان روایات کو ذہن میں رکھئے کہ اُس وقت ڈھال کی قیمت تین درہم تھی۔ لہٰذا تین درہم کی قیمت کی چیز کی چوری پر قطعِ ید کی سزا دی جاتی تھی۔ اب یہ روایات ملاحظہ فرمایئے۔

ڈھال کی قیمت دس درہم تھی

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

(۱) اَلنَّبِیُّ صلعم قَطَعَ یَدَ رَجُلٍ فِی مِجَنٍّ قِیْمَتُہٗ دِیْنَارٌ اَوْ عَشَرَۃُ دَرَاھِمَ ۔ (ابو داؤد)

نبی صلعم نے ڈھال کی چوری پر ایک شخص کا ہاتھ کاٹا۔ ڈھال کی قیمت ایک دینار یا دس درہم تھی۔

پہلے آپ وہ دو روایتیں ملاحظہ فرما چکے ہیں جن میں حضرت ابن عمرؓ نے تصریح کی ہے کہ اس وقت ڈھال کی قیمت تین درہم تھی۔ اب انہی حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی ہوئی یہ روایت ملاحظہ فرمایئے جس میں ڈھال کی قیمت دس درہم بتائی گئی ہے۔

(۲) اَنَّہٗ صلعم لا تقطع الید الا فی ثمن المجن وھو یومئذٍ یساوی عشرۃ دراھم۔

نبی صلعم نے ڈھال کی قیمت والی چیز سے کم پر ہاتھ نہیں کاٹا۔ اور ڈھال کی قیمت اس وقت دس درہم تھی۔ (رواہ محمدؒ فی الاصل - حاشیہ اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ صفحہ ۱۵۱)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

وکان قیمۃ المجن الذی قطع فیہ رسول اللہ صلعم عشرۃ دراھم۔

(نسائیؒ۔ طحاوی۔ حاکم۔ ابن ابی شیبہ)

جس ڈھال کی چوری پر نبی صلعم نے ہاتھ کاٹا تھا اس کی قیمت دس درہم تھی۔

تین درہم قیمت والی چیز کی چوری پر قطع ید

ڈھال کی قیمت والی باقی روایات کو نظرانداز کرتے ہوئے اب ہم ان روایات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن میں چوری کا نصاب سکوں میں متعین کیا گیا ہے۔

(۱) حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰنؓ فرماتی ہیں۔

سارقٌ سرق فی زمان عثمان بن عفان اترجۃً فامر بھا عثمان ان تقوم فقومت بثلثۃ دراھم من صرف اثنی عشر درھما بدینار فقطع عثمان یدہ (موطا امام مالک ما یجب فیہ القطع)

ایک چور نے حضرت عثمانؓ بن عفان کے عہد خلافت میں ترنج (سنگترے کی قسم کا ایک پھل) چرایا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی قیمت لگوائی تو وہ بارہ درہم فی دینار کے حساب سے تین درہم نکلا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔

ربع دینار قیمت کی چیز پر قطع ید

بعض محققین کا خیال ہے کہ دینار حضورؐ کے زمانہ میں دس درہم کا ہوتا تھا بعض کہتے ہیں کہ اس وقت بارہ درہم کا تھا۔ اگر دینار دس درہم کا سمجھا جائے تو ربع دینار (¼ دینار) ۲½ درہم ہوئے اور اگر بارہ درہم کا دینار ہو تو اس کا چوتھائی تین درہم ہوں گے۔ دینار جتنے کا بھی ہو، آپ روایات سنئے جن میں ربع دینار پر قطع ید کی سزا بیان ہوئی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔

(۱) ماطال علیّ وما نسیت القطع فی ربع دینار فصاعدًا۔

(مؤطا امام مالک باب ایضاً)

ابھی کوئی زیادہ مدت نہیں گزری اور نہ ہی میں بھولی ہوں کہ چور کا ہاتھ چوتھائی دینار یا زیادہ میں کاٹا جاتا تھا۔

بخاریؒ و مسلمؒ نے مرفوعاً حضرت عائشہؓ سے ربع دینار کی ایک اور روایت بیان کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

(۲) عن عائشۃؓ عن النبی صلعم قال لا تقطع ید السارق الا ربع دینار فصاعدًا۔ (متفق علیہ)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے سوائے ربع دینار یا اس

سے زیادہ کی چوری سے۔

عمرہ بنت عبدالرحمٰنؓ سے بھی ایک روایت ربع دینار کی تائید میں وارد ہوئی ہے۔

قالت خرجت عائشة زوج النبي صلعم الى مكة ومعها مولاتان لها ومعها غلام لبني عبد الله بن ابي بكر الصديق فبعثت مع المولاتين ببرد مرجل قد خيط عليه خرقة خضراء قالت فاخذ الغلام البرد ففتق عنه فاستخرجه وجعل مكانه لبدًا او فروة وخاط عليه فلما قدمت المولاتان المدينة دفعتا ذلك الى اهله فلما فتقوا عنه وجدوا فيه اللبد ولم يجدوا البرد فكلموا المولاتين فكلمتا عائشة او كتبتا اليها واتهمتا العبد فسئل العبد عن ذلك فاعترف فامرت به عائشة زوج النبي صلعم فقطعت يده وقالت عائشة القطع في ربع دينار فصاعدًا - (موطا امام مالك باب يجب فيه القطع)

عمرہ بنت عبدالرحمٰنؓ سے روایت ہے کہ ام المومنین عائشہؓ صدیقہ مکہ تشریف لے گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی دو آزاد کردہ لونڈیاں تھیں اور عبداللہ بن ابی بکر صدیقؓ کی اولاد کا ایک غلام بھی ان کے ساتھ تھا۔ حضرت عائشہؓ نے مکہ سے دونوں لونڈیوں کے ہاتھ ایک چادر بھیجی جس پر مردوں کی تصویریں[1] بنی ہوئی تھیں اس چادر کو ایک سبز کپڑے میں لپیٹ دیا تھا۔ غلام نے کپڑے کی سیون ادھیڑ کر چادر نکال لی اور اس کی جگہ ایک تھیلا یا پوستین رکھ دی اور پھر سی دیا۔ جب وہ لونڈیاں مدینہ میں پہنچیں اور وہ امانت ان کے سپرد کی جن کی طرف حضرت عائشہؓ نے بھیجی تھی۔ انہوں نے ادھیڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ نمدہ ہے چادر نہیں۔ لونڈیوں سے پوچھا گیا انہوں نے واقعات حضرت عائشہؓ کو بتائے یا انہیں لکھے اور اپنا گمان غلام پر ظاہر کیا۔ غلام سے پوچھا گیا تو اس نے مان لیا۔ حضرت عائشہؓ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم کیا۔ اس کا ہاتھ

---

[1] معلوم نہیں وہ حضرات اس روایت کا کیا جواب دیتے ہیں جو کہتے ہیں کہ فوٹو کھچوانا یا تصویر بنوانا ناجائز ہے۔ مؤطا کے مشہور شارح زرقانی نے یہاں عجیب مزے کی بات لکھی ہے فرماتے ہیں۔ "جاندار کی تصویر اس صورت میں منع ہے جب کہ پوری تصویر ہو اور اس کا سایہ پڑتا ہو۔ اگر محض نقش کے طور پر کسی کپڑے پر ہو جو پوری نہ ہو اور جس کا سایہ نہ پڑے تو کچھ قباحت نہیں" ۱۲۔

کاٹا گیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ربع دینار یا زیادہ میں ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

چوتھائی دینار کی انہی روایات کو امام شافعیؒ، امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیزؒ، امام اوزاعیؒ، امام لیثؒ، ابوثورؒ اور اسحٰقؒ نے دلیل قرار دے کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ سونے کے دینار کے ¼ حصہ کی قیمت والی چیز اگر چرائی جائے تو قطع ید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس کو اگر آپ موجودہ زمانے میں رائج کرنا چاہیں تو پہلے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ حضورؐ کے زمانے میں دینار کا وزن کیا ہوتا تھا۔ پھر اسی وزن کے ایک چوتھائی سونے کی موجودہ زمانے کے مطابق قیمت لگانا ہو گی۔ اور تب کہیں جا کر قطع ید کی سزا دی جا سکے گی۔ خیر یہ درست ہیں ان بحثوں میں نہیں الجھنا چاہیئے۔ تین درہم، ربع دینار وغیرہ کی سی روایات کے بعد اب ان روایات کو دیکھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ دس درہم کی چوری پہ قطع ید کی سزا ہے۔

دس درہم قیمت کی چیز پر قطع ید

امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔

(۱) بلغنا عن رسول اللّٰہ صلعم وعن علی وعن ابن مسعود انھم قالوا لا تقطع الید الا فی عشرۃ دراھم۔

(اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ ص۱۵۵)

علیؓ، ابن مسعودؓ اور خود حضورؐ کی یہ روایت مجھ تک پہنچی۔ انہوں نے فرمایا کہ دس درہم سے کم چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

حضرت ابن مسعودؓ کی یہی روایت طبرانی نے محمد بن نوح ابن حرب، خالد بن ہراں ابو صالح الشبلی، ابو حنیفہ، قاسم بن عبدالرحمٰن، ابوالقاسم عبدالرحمٰن کے واسطوں سے اس طرح بیان کی ہے۔

(۲) عن ابن مسعود عن النبی انہ قال لا یقطع الا فی عشرۃ دراھم (طبرانی)

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ دس درہم سے کم پر قطع ید نہیں۔

الحارثی نے بھی امام اعظمؒ سے حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

(۳) عن ابن مسعود کان تقطع الید علی عہد رسول اللہ صلعم فی عشرۃ دراھم (الحارثی)

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے عہد میں دس درہم کی چوری پر ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔

حضرت مجاہد نے ایمن سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا۔

(۴) لا تقطع الا فی دینار او عشرۃ دراھم۔ (نسائی۔ طحاوی۔ حاکم۔ طبرانی)

ایک دینار یا دس درہم سے کم قیمت کی چیز کی چوری پر قطع ید کی سزا نہیں۔

اسی طرح ایک اور روایت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔

(۵) لا یقطع السارق فی اقل من عشرۃ دراھم۔ (احمد۔ دارقطنی)

دس درہم سے کم کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔

حضرت علیؓ سے بھی اسی کی تائید میں مختلف طرق سے روایات نقل کی گئی ہیں۔

(۶) لا یقطع الکف فی اقل من دینار او عشرۃ دراھم۔

(بیہقی۔ الرعافری۔ الجوہر النقی۔ مسند عبدالرزاق)

ایک دینار یا دس درہم سے کم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

ایک اور روایت میں ہے۔

(۷) لا تقطع الید الا فی عشرۃ دراھم ولا یکون المھر اقل من عشرۃ دراھم۔

دس درہم سے کم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اور نہ ہی دس درہم سے کم مہر ہو گا۔ (بیہقی)

حضرت ابن مسعودؓ کا قول اوپر گزر چکا ہے اسے مستذکرہ بالا طرق کے علاوہ امام محمدؒ نے کتاب الآثار امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اور عبدالرزاق اور طبرانی نے بھی مختلف طرق سے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت میں واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

(۸) اتی عمرؓ بن الخطاب برجل سرق ثوبا فقال لعثمان قومہ فقومہ ثمانیۃ دراھم فلم یقطعہ۔ (کتاب الخراج۔ ابن ابی شیبہ)

فاروق اعظمؓ کے سامنے ایک ایسا شخص لایا گیا جس نے کپڑا چرایا تھا۔ انہوں نے حضرت عثمان کو کپڑے کی قیمت لگانے کا حکم دیا۔ انہوں نے آٹھ درہم قیمت لگائی۔ پس اس کا ہاتھ نہ کاٹا گیا۔

اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے قاری فرماتے ہیں۔

ھذا یدل علی انتساخ ما فی الصحیحین۔ (شرح المختصر)

یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ صحیحین میں جو روایات (تین درہم یا ربع دینار کی) بیان ہوئی ہیں وہ منسوخ ہو چکی ہیں۔

یہی روایت بعض کتابوں میں ان تفاصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں۔

وقد روی ان عمر رضی اللہ عنہ اتی بسارق سرق ثوبا فامر لقطع یدہ فقال عثمانؓ ان سرقتہ لا تساوی عشرۃ دراھم فامر بتقویمہ فقوم بثمانیۃ دراھم فدرأ الحد عنہ۔ (المبسوط جلد ۹ صفحہ ۱۳۷)

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک چور لایا گیا جس نے ایک کپڑا چرایا تھا آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا ممکن ہے کپڑے کی قیمت دس درہم سے کم ہو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اس کی

اختلافات قیمت لگانے کا حکم دیا۔ قیمت آٹھ درہم لگائی گئی۔ پس وہ حد سے بچ گیا۔

ان مختلف روایات نے مختلف فرقوں کو جنم دیا ہے۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں۔

اختلفوا فی اشتراط النصاب وقدرہ فقال الشافعی ربع دینار ذھبا او ماقیمۃ ربع دینار ھو قول عائشۃ وعمر بن عبدالعزیز والاوزاعی واللیث وابی ثور واسحٰق وغیرھم وقال مالک واحمد واسحٰق فی روایۃ یقطع فی ربع دینار او ثلثۃ دراھم او ماقیمۃ احدھما وقال ابوحنیفہ واصحابہ لا یقطع الا فی عشرۃ دراھم او ما قیمۃ ذلک۔ (بحوالہ مرقات شرح مشکوٰۃ)

چوری کے نصاب کی شرائط اور مقدار میں اختلاف ہے امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ چوری کا نصاب سونے کے دینار کا چوتھائی حصہ ہے۔ یا جو چیز اس کی قیمت کی ہو۔ حضرت عائشہؓ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اوزاعیؒ۔ لیثؒ۔ ابو ثورؒ اور اسحٰقؒ بھی یہی قول ہے۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور ایک روایت میں اسحٰق کا بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ قطع ید کی سزا ربع دینار یا تین درہم میں ہے یا جو چیز کہ ان میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر ہو۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ قطع ید دس درہم پر ہے یا جس چیز کی قیمت دس درہم کے برابر ہو۔

ہم نے صرف معروف روایات بیان کی ہیں ورنہ اگر روایات کے اختلافات کا استقصاء کیا جائے تو صرف اسی سرقہ کے نصاب میں ہی دفتروں کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ ہم نے بعض ائمہ کے قول بھی چھوڑ دیئے ہیں اور اس تفصیل کو بھی نہیں چھیڑا کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک چوری کا نصاب پانچ درہم کیوں تھا؟ غرضیکہ فہم مطالب میں آسانی کی خاطر ہم نے محض چند روایات ذکر کی ہیں۔

عملی مشکل ان روایات کو ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ آج جو لوگ سنت کو قانون کا ماخذ منوانے پر تلے ہوئے ہیں انہیں عملی دنیا سے کس قدر بُعد ہے۔ غور کیجئے کہ اگر آج بالفرض تین درہم کو چوری کا نصاب قرار دے کر ہم حد جاری کرنا شروع کر دیں تو کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ سب سے بڑا نتیجہ تو یہ ظہور پذیر ہوگا کہ علمائے احناف اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہونگے۔ اور اپنی کتابیں بغل میں داب کر حکومت کو چیلنج کریں گے کہ ثابت کرو کہ حدیث جس میں تین درہم پر قطع ید کی سزا مذکور ہے

منسوخ نہیں ہوئی؟ دوسرے ہر قلبِ حساس میں یہ کھٹک موجود رہے گی کہ ممکن ہے کہ تین درہم والی روایت ضعیف یا منسوخ ہو اور صحیح حدیث پر عمل نہ ہو رہا ہو۔ اگر دس درہم کو آپ نصاب مقرر کریں تو علمائے اہلِ حدیث۔ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ مناظرہ پر تل جائیں گے اور پھر اہلِ فکر کا ایک طبقہ ایسا بھی ہو گا جو کہے گا کہ اگر سرقہ کا نصاب متعین کرنا ایسا ہی ضروری امر تھا تو خدائے قدوس نے کتاب اللہ میں تین درہم، ربع دینار، یا دس درہم کے مختصر الفاظ کیوں نہ لکھ دئے۔ کیوں ہمیں اختلافات کا شکار بنایا اور اگر معاذ اللہ اللہ سے یہ کام نہ ہو سکا تو رسولِ خدا ہی واضح الفاظ میں فرما دیتے اور لکھوا کر دے جاتے تاکہ امت افتراق کا شکار نہ ہوتی۔

اس کا حل

حق یہ ہے کہ اللہ نے اسے اسی لئے غیر متعین چھوڑا تھا کہ ہر زمانے میں زعمائے ملت باہمی مشاورت سے طے کر لیں کہ کتنی قیمت کی چیز کو ایسا سرقہ قرار دیا جائے جس پر قطع ید کی سزا دی جا سکے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ روایات کا باہمی اختلاف بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ مختلف وقتوں میں سرقہ کا نصاب مختلف ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ کے عملی مسائل کتاب اللہ کے اصولوں کو مدِنظر رکھ کر اس زمانے میں طے کئے جانے چاہئیں۔

سرورِ کائنات صلعم نے فریضۂ رسالت بہ تمام و کمال ادا کر دیا۔ نعوذ باللہ ہم یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ اتنے عظیم اور اہم فریضہ کو انہوں نے اس حالت میں چھوڑا ہو کہ بعد میں آنے والے افتراق و اختلاف کا شکار ہو کر اپنے بھائیوں پر ہی بے دینی کے آوازے کسنے لگیں۔

اس مختصر سے مضمون کا مقصود محض یہی تھا کہ سنت کو قانون کا ماخذ تسلیم کرنے والوں سے پوچھیں کہ آخر ان عملی مشکلات کا کیا حل ہو گا جن میں سے ایک ابھی ابھی آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ حضرات کسی بدنیتی سے ایسا نہیں کرتے بلکہ انہوں نے دین کو فی الواقع روایات پر منحصر سمجھ لیا ہے اور اس دنیا کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے جس کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ہر قلبِ حساس کو وقفِ اضطراب کر رکھا ہے۔ ہمیں اس امر پر بھی پوری طرح یقین ہے کہ یہ حضرات ہماری ان گزارشات پر پورے خلوص اور دیانتداری سے غور فرمائیں گے اور اسلام کو دنیا کے متغیر احوال کا رہنما ثابت کرنے اور امتِ واحدہ کو فتنہ و افتراق کے ملعون جنگل سے بچانے کے لئے حبل اللہ المتین، کتاب اللہ العزیز کا مقدس دامن تھام لیں گے۔ کیونکہ ہم جو انہیں آگاہ کرتے ہیں تو ہمارے ہاتھوں میں بھی کسی ولیم میور کا قلم نہیں۔ ہم بھی اپنے آپ کو مومن و مسلم سمجھتے ہیں اور ہمارے مخاطب علمائے کرام کو تو اپنے ایمان پر اس قدر اطمینان ہے کہ خود ہی مسندِ عدالت بچھا لیتے ہیں اور خود ہی اس پر دولتی ٹھوک کر دوسروں کے ایمان کو تولتے ہیں اور پھر اللہ کے نام لیواؤں اور شمعِ رسالت کے پروانوں میں سے کسی کو کافر ٹھہراتے ہیں کسی کو بدعتی، زندیق، ضال مضل اور مردود و ملعون کے القاب سے نوازتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن ہر اتوار کو بوقت ۹½ بجے صبح ۲۵/بی گلبرگ میں سنئے۔

قائدِ اعظمؒ کا پاکستان

ادارۂ طلوعِ اسلام لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قائدِ اعظمؒ کا پاکستان

[۲۵ دسمبر ۱۹۶۲ء کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام، قائدِ اعظمؒ کے یوم پیدائش کی تقریب پر ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں پرویز صاحب نے عنوانِ بالا پر برجستہ تقریر کی۔ اسے بعد میں طلوعِ اسلام میں اشاعت کے لئے مرتب کر لیا گیا۔ وھو ھٰذا۔ طلوعِ اسلام]۔

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز! سلام و رحمت!

کیا اس قسم کی بات آپ کے لئے وجۂ تعجب نہ ہو گی کہ ایک شخص کسی شے کی تلاش میں برسوں تک مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کے حصول کے لئے اس نے دن رات ایک کر دئیے۔ دنیا بھر کی مخالفت مول لی۔ وقت، دولت، توانائی صرف کی۔ بالآخر خدا خدا کر کے وہ گوہرِ مقصود ہاتھ آیا تو وہ سوچنے بیٹھ گیا کہ میں نے اس چیز کو مانگا کیوں تھا؟ میں نے اسے حاصل کس مقصد کے لئے کیا ہے؟ اسے کس مصرف میں لایا جائے گا؟

یقیناً یہ کہانی آپ کے لئے وجۂ تعجب ہو گی لیکن اس سے کہیں زیادہ وجۂ تعجب اور باعثِ حیرت یہ حقیقت ہو گی کہ یہ کہانی کسی اور کی نہیں، یہ خود ہماری اپنی کہانی ہے۔ ملّتِ پاکستانیہ کی کہانی ہے۔ ہم نے دنیا کے سامنے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبہ کی سخت مخالفت ہوئی۔ ہم نے ان مخالفتوں کا سرتوڑ مقابلہ کیا۔ اس لئے کہ یہ ہماری زندگی کا نصب العین۔ ہماری تمناؤں کا مرکز اور ہماری آرزوؤں کا محور تھا۔ اس کے ساتھ ہماری موت اور زندگی کا سوال وابستہ تھا۔ ہم نے اس کے حصول کے لئے دس برس تک مسلسل جد و جہد کی۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں ہمارا یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ پاکستان وجود میں آگیا۔

پاکستان کیوں مانگا تھا؟

لیکن جب یہ وجود میں آگیا تو ہم نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اس مطالبہ سے ہمارا مقصد کیا تھا؟ پاکستان سے بالآخر مفہوم کیا ہے؟ اسے کیا کیا جائے؟ اسے کیسا بنایا جائے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پاکستان کو وجود میں آئے پندرہ برس ہو گئے لیکن ہم ملّی اعتبار سے ابھی تک متعین نہیں کر سکے کہ ہم نے اسے حاصل کس مقصد کے لئے کیا تھا؟ ہمارے اس ذہنی انتشار کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک طرف سے آواز

آتی ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظری نے پاکستان بنوادیا۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتے۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے۔ تو انہیں ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک بھی نہ آتا۔

بھانت بھانت کی بولیاں

گویا مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کسی مثبت جذبہ پر نہیں تھی بلکہ محض ہندوؤں کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر ہم نے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آج بھی ہندو یہ وعدہ کرلے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرے گا تو ہم اپنی جداگانہ مملکت کو چھوڑ کر پھر اس کے ساتھ جاملیں گے (یا للعجب!)

دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ صاحب! یہ تو انگریز کی چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو چھوڑ کر جائے تو ایسی شکل میں کہ ہندو اور مسلمان ہمیشہ آپس میں لڑتے رہیں۔ اس لئے اس نے پاکستان کا تصور پیدا کیا اور مسٹر جناح کو آگے بڑھایا۔ گویا مسٹر جناح انگریز کے اس مقصد کے بروئے کار لانے کے لئے آلۂ کار تھے! یہ اس شخص کی نسبت کہا جاتا ہے جس کے متعلق اس کے بدترین دشمنوں تک کا اعتراف تھا کہ وہ کسی قیمت پر کسی کے ہاتھ بک نہیں سکتا تھا۔"

غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ آیئے! اس تھوڑے سے وقت کو غنیمت جانیں اور ہم خود قائد اعظمؒ سے پوچھیں کہ آپ نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ آپ الگ مملکت کیوں چاہتے تھے۔ اس مملکت کا تصور آپ کے ذہن میں کیا تھا۔ اسے آپ نے کس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا؟ اسے آپ کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ کیا بنانا چاہتے تھے؟ ان سوالات کے جواب میں جو کچھ قائد اعظمؒ کہیں، اس سے بڑی شہادت اس باب میں کوئی اور ہو نہیں سکتی۔

پاکستان کب وجود میں آیا تھا؟

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے۔ قائد اعظمؒ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک اہم تقریر کی جس کا چرچا بڑی دیر تک رہا۔ اس میں سوال زیر نظر یہ تھا کہ پاکستان کے تصور سے مطلب کیا ہے۔ اس مطالبہ کی بنیاد کیا ہے۔ اس کی وجہ جواز کیا ہے۔ یہ یکایک افق ذہنی سے کیسے ابھر آیا۔ یہ نظریہ نکل کہاں سے پڑا۔ یہ تھے وہ سوالات جن کا جواب دینے کے لئے قائد اعظم اٹھے تھے۔

قائد اعظم کا انداز یہ تھا کہ وہ بات بڑی مختصر کرتے تھے لیکن وہ ہوتی تھی بڑی جامع۔ صاف، سیدھی۔ دو ٹوک۔ اس میں نہ کوئی پیچ وخم ہوتا تھا۔ نہ ابہام یا الجھاؤ۔ انہوں نے مذکورہ بالا سوالات کا جواب ایک فقرہ میں دے دیا۔ اور وہ فقرہ ایسا ہے کہ جوں جوں اس پر غور کیجئے نگہ بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ اس سے نہ صرف مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اور وجہ جواز ہی سامنے آجاتی ہے بلکہ خود اسلام کا ایک بنیادی اصول بھی اس طرح اجاگر ہو جاتا ہے کہ اس سے بہت سے سیاسی عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ

پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

نظریۂ قومیت

غور فرمایا آپ نے کہ اس سیدھے سادے اور مختصر سے جملے میں کتنی بڑی حقیقت کو بے نقاب کر دیا گیا ہے؟ آج اگر ہندوستان میں کوئی ہندو عیسائی ہو جائے تو اس کے صرف مذہبی عقیدہ میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کی سیاسی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ جس طرح پہلے ہندوستانی قوم کا فرد تھا، اسی طرح، اس تبدیلیٔ مذہب کے بعد بھی اسی قوم کا فرد رہے گا۔ یا مثلاً انگلستان میں یہودیت کے پیرو بھی بستے ہیں اور عیسائی بھی۔ اگر کوئی یہودی اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی ہو جاتا ہے، تو اس سے اس کی قومیت (NATIONALITY) پر کوئی اثر نہیں پڑتا وہ بدستور انگلستانی رہتا ہے۔ لیکن اسلام کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں جہاں کوئی شخص اسلام لاتا ہے، وہ ایک جداگانہ قوم (اُمتِ مسلمہ) کا فرد بن جاتا ہے۔ اس سے صرف اس کا مذہب ہی نہیں بدلتا۔ اس کی قومیت بھی بدل جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، اسلام میں قومیت کا مدار، نسل۔ رنگ۔ زبان یا وطن کا اشتراک نہیں۔ اس کا مدار، دین کا اشتراک ہے۔ جو لوگ دنیا میں مشترک مسلمان ہیں وہ دنیا کے کسی خطے میں بستے ہوں۔ کسی نسل سے متعلق ہوں۔ کوئی زبان بولتے ہوں۔ وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں اس کے برعکس اگر وہ ایک ہی ملک میں بستے ہوں اور ایک ہی نسل کیا بلکہ ایک ہی خاندان سے بھی متعلق کیوں نہ ہوں، اگر وہ دین میں مشترک نہیں (دونوں مسلمان نہیں) تو وہ دو الگ الگ قوموں کے افراد ہیں — فارس کا سلمانؓ۔ روم کا صہیبؓ۔ حبشہ کا بلالؓ اور عرب کا حمزہؓ نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن کے اختلاف کے باوجود محض دین کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد تھے، لیکن محمدؐ رسول اللہ اور حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب — دو الگ الگ قومیتیں رکھتے تھے — یہی وہ اسلام کا اصل الاصول تھا جسے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اور اسی حقیقت کو قائدِ اعظمؒ نے اس چھوٹے سے فقرے میں بیان کر دیا تھا کہ

پاکستان اس دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔

وہ غیر مسلم جب مسلمان ہوا تو پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی — اور جب ایک نئی قوم وجود میں آ گئی تو اس کے لئے ایک الگ مملکت کی ضرورت بھی مسلم ہو گئی۔ اس طرح پاکستان کی پہلی اینٹ اس دن رکھی گئی جب یہاں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ اس کی وجہ نہ ہندو کی تنگ نظری تھی نہ انگریز کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔

یہ مسلمانوں کے دین کا تقاضا تھا۔ چونکہ دنیا کے سامنے یہ نظریہ بالکل نیا اور قومیت کا یہ تصور مروجہ راستوں سے ہٹا ہوا تھا (اگرچہ اسلام نے اسے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا ——— چودہ سو سال پہلے کیوں؟ یہ تو اس دن پیش کر دیا گیا تھا جب سب سے پہلے نبی کی وساطت سے خدا کی وحی انسانوں تک آئی تھی) اس لئے اس کی ضرورت تھی کہ اسے بار بار دہرایا جائے اور مختلف گوشوں سے اس کی وضاحت کی جائے۔ چنانچہ قائداعظمؒ نے مسلسل دس برس تک دہرایا ہے۔ انہوں نے ۱۹ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلمان الگ قوم ہیں

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش، ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں۔

یہ فرق اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا تھا جب "مذہب" اور "دین" کا فرق سمجھ میں آ جائے۔ "مذہب" (جسے عام طور پر RELIGION کہہ کر پکارا جاتا ہے) خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی۔ عمرانی۔ سیاسی۔ معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس "پرائیویٹ تعلق" کو ایک عیسائی اپنے گرجے میں، ایک پارسی اپنے آتشکدہ میں۔ ایک ہندو اپنے مندر میں (اور انہی لوگوں کے خیال کے مطابق) ایک مسلمان اپنی مسجد میں ——— بلکہ یوں سمجھئے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے کسی کونے میں، یا پہاڑ کے کسی غار میں اپنے اپنے طور پر قائم کر سکتا ہے۔ جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو "مذہب" کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کریں گے۔ یہ ہے مذہب کا تصور۔ اس کے برعکس "دین" کا تصور یہ ہے کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں۔ یہ زندگی

مذہب اور دین کا فرق

کا ایک ضابطہ اور نظام حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے ۲۴ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام "ایک مذہب" نہیں بلکہ "دین" ہے جسے آج کی اصطلاح میں تمدنی نظام کہنا چاہئیے۔ یہ "دین" ایک الگ آزاد مملکت میں ہی برتے کار آ سکتا ہے جہاں اس کے احکام اور اصول قانون کی شکل میں نافذ کئے جائیں۔ (مہاتما) گاندھی کی دوربین نگاہ نے اس "خطرہ" کو بھانپ لیا اور سمجھ لیا کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے مذہب اور دین کے

اس تصور کی مخالفت

اس تصور کو نکال نہ دیا جائے اور انہیں یہ باور نہ کرا دیا جائے کہ اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے اس وقت تک پاکستان کے مقدمہ کو جیتا نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے بہتر طریق کار یہ سوچا کہ ہندوستانی بچوں (ہندوؤں اور مسلمانوں سب کے بچوں) کی تعلیم میں یہ بات داخل کر دی جائے کہ

سب مذاہب سچے ہیں۔ رام بھی وہی ہے رحیم بھی وہی۔ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فضیلت نہیں۔ اسلام۔ ہندو دھرم عیسائیت وغیرہ سب یکساں ہیں اس کے لئے انہوں اپنی مشہور تعلیمی اسکیم (ودیا مندر یا ودھا کی اسکیم) جاری کی اور اسے عملاً مدرسوں میں نافذ کرنا چاہا۔[1]

ہندو یہ کچھ کر رہا تھا۔ اس نے یہ کچھ کرنا ہی تھا۔ پاکستان کے مطالبہ سے اس کا وہ خواب پریشاں ہوا جا رہا تھا جس کی رُو سے وہ ہندوستان کی مسلم آبادی پر اپنی حکومت مسلط کرنا چاہتا تھا لیکن آسمان کی آنکھ اس عبرت انگیز تماشا کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ اس کی اس مخالفت میں خود مسلمانوں کے اکابرین ـــ بالخصوص دین کے علمبردار حضرات ـــ ان سے بھی آگے آگے تھے۔ چنانچہ "مذہب اور دین" کے اس فرق کو مٹانے اور اسلام کو باقی مذاہب جیسا ایک مذہب ثابت کرنے کے لئے، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر القرآن (ترجمان القرآن) لکھی جس کی جلد اول (تفسیر سورۂ فاتحہ) میں بار بار اس "دعوے" کو دہرایا گیا کہ

> عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اسلام کا کہنا ہے کہ اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب پر کاربند ہو جائیں تو میرا منشا پورا ہو جاتا ہے[2]

کانگریس نے ان کی اس تفسیر کا ترجمہ مختلف زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کرایا۔

ادھر یہ کچھ ہو رہا تھا اور ادھر قائداعظم اپنی اس پکار کو برابر دہرائے جا رہے تھے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، دین ہے۔ چنانچہ جب مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (لاہور) میں، پاکستان کا ریزولیوشن پیش ہوا، تو انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:-

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت

---

[1] طلوع اسلام نے جس شد و مد سے اس اسکیم کی مخالفت کی اس کی شہادت اس کے اس زمانے کے فائل سے مل سکتی ہے۔ اس نے اس کے خلاف مسلسل مضامین لکھے پمفلٹ چھپوائے۔ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع کئے۔ اسے ایک ملک گیر تحریک کی شکل دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اسکیم منسوخ ہو گئی اور اس کے تحت تیار کردہ نصاب کی کتابیں، بحرۂ عرب میں ڈبو دینی پڑیں۔ (طلوع اسلام)

[2] مولانا آزاد (مرحوم) کی اس تفسیر کی تردید میں پرویز صاحب نے اسی زمانے میں ایک بھرپور مقالہ لکھا جسے ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا یہ مقالہ اب ان کے مضامین (فردوس گم گشتہ) میں شامل ہے۔ (طلوع اسلام)

ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یک جا کر دینا باہمی منافقت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے[1]۔

ان تصریحات کے ساتھ مطالبۂ پاکستان کا ریزولیشن پاس کیا گیا جس سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے مطالبہ کو شیاسی سند حاصل ہو گئی۔

اسلامی مملکت کے قیام کیلئے

اس کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ جب یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے گا تو اس میں مملکت کس انداز کی قائم ہو گی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پاکستان کا تصور، علامہ اقبالؒ نے اپنے الٰہ آباد (مسلم لیگ) کے خطبہ میں ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا اس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ۔

> مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ، ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہو گا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی۔ اور اسلام کو اس سے ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس دھبہ کو مٹا سکے جو عرب (ملوکیت) نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے۔ اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم، اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے۔ اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔

اسلام خالص

برادرانِ گرامی قدر! وقت نہیں ورنہ میں وضاحت سے بتاتا کہ علامہ اقبالؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں اسلام کو موقع میسر آجائے گا کہ یہ اس دھبے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے تو اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جس کی طرف وہ چند لفظوں میں اشارہ کر گئے ہیں۔ میں اس وقت صرف اتنا کہہ کر اپنے موضوع کی طرف آجانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں جو اسلام اس وقت بالعموم مروج ہے وہ بیشتر مجموعی، ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ علامہ اقبالؒ یہ چاہتے تھے کہ اگر پاکستان کا خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں اُس

---

[1] یہی وہ ریزولیشن تھا جس کے متعلق امیر جماعت اسلامی، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ جب میں مسلم لیگ کا ریزولیشن دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم)

اور یہ کہ۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے (ایضاً)

(طلوع اسلام)

حقیقی اسلام کو پھر سے عملاً متشکل کیا جائے جو عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں وجہِ نازِ عالم تھا۔ اس طرح اسلام سے وہ دھبہ مٹ سکے گا جو اس پر عرب ملوکیت نے صدیوں سے لگا رکھا ہے۔ یعنی پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگا اور اس میں اسلام اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں رائج ہوگا۔

علامہ اقبالؒ کے یہی وہ بلند تصورات تھے جن کی بنا پر قائداعظمؒ نے (۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کو) یوم اقبال کی تقریب پر انہیں ان گراں قدر الفاظ میں یاد فرمایا۔

> علامہ اقبالؒ اگرچہ ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے لیکن وہ عملی سیاست دان بھی کم پائے کے نہ تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بنیاد پر ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو ہندوستان سے الگ کر کے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جا سکتی ہے[1]۔

یعنی پاکستان سے مقصود وہ خطۂ زمین تھا جس میں اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے (مارچ ۱۹۴۱ء میں) پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> پاکستان کے تصور کو جو مسلمانوں کے لئے اب ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات، اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اس سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مسلم مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔

اس سے ظاہر ہے کہ قائداعظم کے ذہن میں یہ تصور موجود تھا کہ پاکستان، مسلمانوں کی دوسری مملکتوں جیسی مملکت نہیں ہوگی۔ یہ وہ مملکت ہوگی جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔

اسلامی قوانین

انہوں نے (۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو) فرنٹیئر مسلم لیگ (پشاور) کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات۔ ثقافتی نشوونما۔

---

[1] قائداعظمؒ کے، علامہ اقبال کے متعلق یہ خیالات تھے اور حضرت علامہ (مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلے میں) اپنے آپ کو "قائداعظم" کا سپاہی" کہا کرتے تھے — سچ ہے۔ جب مقصد میں ہم آہنگی اور دلوں میں خلوص ہو تو پھر باہمی رقابت کا جذبہ، محبت میں بدل جایا کرتا ہے۔

بہ طوفِ شعلہ پروانہ با پروانہ می رقصد (طلوعِ اسلام)

روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا۔

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل ہی نہیں کرنی۔ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔[سلہ]

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ قائداعظمؒ کا انداز یہ تھا کہ وہ کسی بات کو مبہم اور غیر واضح نہیں رہنے دیتے تھا۔ پاکستان کے متعلق ابھی تک ان کے یہ خیالات ہمارے سامنے آ سکے ہیں کہ اس سے مقصد اسلامی مملکت تھا جس میں ہم اپنے تصورات کے مطابق اسلامی قوانین کے تابع زندگی بسر کریں۔ "اسلامی مملکت"۔ "اسلامی نظام" حتیٰ کہ اسلامی قوانین "سے کیا مراد ہے"؛ مختلف سمتوں سے اس کا جواب مختلف ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قائداعظمؒ نے ان اصطلاحات کو ویسے ہی استعمال کر دیا تھا یا اپنے مفہوم کو متعین طور پر بھی بیان کیا تھا۔!

انھوں نے حسبِ عادت متعین طور پر بتا دیا تھا کہ "اسلامی نظام" سے ان کا مقصد کیا ہے؛ اگست ۱۹۴۱ء میں وہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے اس باب میں کچھ سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے جواب میں

سلہ قائداعظمؒ اٹھتے بیٹھتے اس حقیقت کو واضح کرتے چلے جاتے تھے کہ پاکستان میں اسلامی مملکت قائم ہوگی۔ اس میں اسلامی تصورات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر ہوگی لیکن جو لوگ پاکستان کے خلاف تھے وہ اس کے برعکس یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ بابت محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۲)

ہندوستان میں مسلمانوں کو یہ کہہ کر پاکستان کے خلاف بھڑکایا گیا لیکن جب یہی صاحب پاکستان تشریف لے آئے تو اب یہ کہا جا رہا ہے کہ

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو کہا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہو اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیڈروں کے ذہن میں اس وقت خواہ کچھ بھی ہو مگر انکم زبانوں سے انہوں نے ہر اسٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی دعووں اور ان کے ظاہر کردہ ارادوں پر یقین کر کے تحریکِ پاکستان میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ (دستوری سفارشات پر تنقید۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحہ ۷) یعنی ہندوستان میں یہ کہا گیا کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے اپنی کسی تقریر میں یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ لیگ کے لیڈر ہر اسٹیج اور ہر منبر سے کہا کرتے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ انسان کی دیدہ دلیری کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ (طلوعِ اسلام)

انہوں نے جو کچھ کہا، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام سے ان کا متعین مفہوم کیا تھا۔

سوال - مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب :- جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن، خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک، مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوے ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات

قرآنی مملکت

میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں، بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔"

قائداعظمؒ کا اپنے متعلق اعتراف و اعلان یہ ہے کہ "میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔" لیکن اسلامی نظام کی اصل و بنیاد کے متعلق جو کچھ انہوں نے سمجھا اور کہا ہے، ذرا غور کیجئے کہ دینیات میں مہارت کے مدعی کتنے ہیں جو اسلام کے متعلق اس گہرائی تک پہنچ سکے ہیں؟

سر خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت
در حیرتم کہ دُرد کشاں از کجا شنید؟

اشتراکیت

سوال - اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :- اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔"

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں سمو کر رکھ دیا گیا ہے۔ روس کی کمیونزم ہو یا مغرب کی ڈیماکریسی۔ یہ سب اسلامی نظام کے مختلف اجزاء کی بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ جب تک ان میں سے انسانی تصورات کو نکال کر ان کی جگہ "خدا" شامل نہ کر دیا جائے، یہ مسالک نوع انسانی کے لئے کبھی ایسے منفعت بخش نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو اسلامی نظام کا خاصہ ہیں۔

اب اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے، جو میرے نزدیک اس موضوع پر مقطع کا بند ہے۔ غور سے سنئے۔

سوال - اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب :- اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام

صرف قرآن کی اطاعت

میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم، مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت اسلامی کس طرح بنتی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اس کے سوا کسی اور کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کسی اور کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منوائے۔

لیکن خدا تو ایک ان دیکھی، مطلق ذات کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہوگی؟ کیسے معلوم کیا جائے گا کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔ (۷/۳)۔ "جو کچھ تمہاری طرف خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتباع مت کرو" بالفاظ دیگر "اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے" اسی کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ یہی چیز کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز قرار پاتی ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔"

"مسٹر جناح" پاکستان کی اسلامی مملکت کے متعلق یہ تصور پیش کر رہا تھا اور دین کے علمبردار حضرات یہ کہکر مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے کہ

> جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔

یعنی جس حکومت کے متعلق یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ اس میں آزادی اور پابندی کے حدود، خدا کے متعین کردہ ہوں گے اس کے خلاف لوگوں کو یہ کہکر بھڑکایا جا رہا تھا کہ وہ "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" ہوگی۔

ہم نے برادرانِ عزیز! دیکھ لیا ہے کہ قائداعظم کے نزدیک مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور اور ضابطہ قرآن کریم کو قرار

پانا تھا۔ قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت قائد اعظمؒ کے اُفقِ ذہن پر کس طرح چھائی ہوئی تھی، اس کا اندازہ ان کے ان بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جن میں وہ وقتاً فوقتاً اس حقیقت کو سامنے لاتے رہے۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں قوم کے نام عید کے پیغام میں انہوں نے فرمایا:-

قرآن کی جامعیت

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ

"بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے، جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے۔ جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام احوال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن، مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات۔ روح کی نجات کا سوال ہو، یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

یہ تھی قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت جس پر قائد اعظمؒ کا ایمان تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان، مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسلی اور صوبائی تعصب بھی موجود تھا۔ خود پاکستان کو جن دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہونا تھا (یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان) ان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ لسانی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے بھی ان دونوں خطوں کے

مسلمانوں میں وجہِ جامعیت

رہنے والوں میں کوئی وجہِ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہِ اختلاف کے باوجود وہ کون سی قدرِ مشترک تھی جو ان باہم گریزاں عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی؟ اس کا جواب قائد اعظمؒ کے الفاظ میں سنئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء۔ واقع کراچی) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

"وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

> وہ بندھن۔ وہ رشتہ۔ وہ چٹان۔ وہ لنگر۔ خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔
>
> ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک کتاب۔ ایک اُمت۔

بکھرے ہوئے مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا یہ وہ طریق تھا جسے خود خدا نے تجویز کیا تھا جب کہا تھا کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ـــــ (۳/۱۰۲) "تم سب مل کر خدا کے اس رسشتہ کو محکم طور پر تھام لو۔ اور تفرقہ پیدا نہ کرو" قرآن پر ایمان لانے سے دنیا کے مختلف انسان، ایک قوم بنتے ہیں اور اس کے ساتھ وابستہ رہنے سے ان کی وحدت برقرار رہ سکتی ہے اسی کو قائد اعظم نے اہل پاکستان کے لئے وجہ جامعیت قرار دیا تھا۔

یہ کچھ قائد اعظم نے حصول پاکستان سے پہلے کہا تھا۔ بعض گوشوں سے اب یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ پاکستان سے پہلے تو بے شک

حصول پاکستان کے بعد

قائد اعظم نے یہی کچھ کہا تھا لیکن حصول پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کر لی تھی۔

نہ صرف یہ کہ یہ دعویٰ واقعات کے خلاف ہے، جس شخص کو قائد اعظم کی طبیعت اور کردار سے ذرا سی بھی واقفیت ہے وہ بلا توقف کہہ دے گا کہ "ھٰذا بھتان عظیم"۔ حصول پاکستان کے بعد انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں، خالق دینا ہال (کراچی) میں حکومت کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں۔ اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدل عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جاسکیں۔

اسلام کے عدل عمرانی کے اصول کیا ہیں، اس کی تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئیگی۔ اس مقام پر میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن اسلامی

لہ ابھی قائد اعظم کے متعلق مودودی صاحب یہ پراپیگنڈہ کر رہے تھے کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم)

اسلامی ذہنیت تو ان معترضین کی واحد ملکیت تھی (اور ہے) (طلوع اسلام)

اصولوں کا اعلان، قائدِ اعظم تحریکِ پاکستان کے دوران میں کیا کرتے تھے، انہی کا اعادہ وہ حصولِ پاکستان کے بعد بھی کرتے رہے تقسیمِ ہند کے بعد ہندوؤں نے جس قدر مسلمانوں کا کشت و خون کیا وہ تاریخ کی نہایت عبرت انگیز خونی داستان ہے۔ اس وقت حالات بڑے نازک تھے۔ جن کی وجہ سے مسلمان بہت مضطرب و پریشان تھے۔ ان حالات میں قائدِ اعظمؒ نے، ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم (لاہور) میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

اگر ہم نے ان حالات میں قرآن سے راہ نمائی لی تو ہم ہندوؤں کی سازش کے علی الرغم کامیاب ہو کر رہیں گے۔

وہ ایسے نامساعد حالات میں بھی، قرآن ہی سے راہ نمائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

دستورِ پاکستان

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ دستورِ پاکستان کی تدوین کا تھا۔ ساری دنیا کی نظریں پاکستان کی طرف اٹھ رہی تھیں ـــــ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ نوزائیدہ مملکت جو اسلام کے ازسرِ نو احیاء کا دعوےٰ لے کر وجود میں آئی ہے اپنے لئے دستور کس انداز کا مرتب کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں، قائدِ اعظم نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کیا جس میں کہا کہ

پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔

تھیاکریسی نہیں ہوگی

کچھ بھی ہو یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔

اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا جناب من! کہ ہمارے مذہبی پیشوا تحریکِ پاکستان کے خلاف کیوں تھے اور وہ کیوں "مسٹر جناح" کے خلاف اس قدر پروپیگنڈہ کرتے تھے؟ یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ قائدِ اعظمؒ کی عمر نے وفا نہ کی اور انہیں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ دستورِ پاکستان کو مرتب کر سکتے۔ ورنہ یہاں چودہ پندرہ سال سے مذہب کے نام پر جو انتشار پیدا کیا جا رہا ہے، ملک اس سے بچ جاتا، اور اس وقت تک ہماری کشتیٔ ملت کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی ـــــ بہرحال یہ ایک الگ داستان ہے جو ہمارے آج کے موضوع سے ہٹی ہوئی ہے۔

اب اسلام کے عدل عمرانی کے ان اصولوں کو دیکھئے جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسلام کا منتہیٰ یہ ہے کہ ایک فرد کی تمام مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد حیات آخروی میں، زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا

اسلام کا عدل عمرانی

ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے افراد کو، زندگی کی بنیادی ضروریات (خوراک۔ لباس۔ مکان۔ وغیرہ) کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے تاکہ وہ اطمینان سے بلند مقاصد انسانیت کے حصول کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ اس کے لئے اسلامی نظام مملکت، تمام افراد مملکت کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ "ہم خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریات زندگی کا ذمہ لیتے ہیں۔"

اس کا نام اسلام کا عدل عمرانی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ۔

> سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا مستقبل اس سوال کے حل پر موقوف ہے اگر لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے اس آئین کو دور حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا، بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ شروع میں تھا۔

تشکیل پاکستان کے بعد جب مملکت نے اپنا (سٹیٹ) بینک کھولا تو، جولائی ۱۹۴۸ء میں اس کے افتتاح کی تقریب قائداعظمؒ کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو تقریر فرمائی (اور میرا خیال ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں کہا کہ۔

> ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے، اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے

بچائے گا اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

لیکن ظاہر ہے کہ جاگیرداری۔ زمینداری اور سرمایہ داری کی موجودگی میں اسلام کا یہ معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ملک کے بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن قائدِ اعظمؒ انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہوگی۔ انہوں نے تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں برملا اعلان کیا کہ۔

زمینداری اور سرمایہ داری

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے .... میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں، خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے! اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا! اگر ان سرمایہ داری کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

مملکتِ پاکستان کا نقشہ

برادرانِ عزیز! یہ تھا مختصر الفاظ میں، قائدِ اعظمؒ کے تصور کی رو سے پاکستان کا نقشہ۔ یعنی۔

(۱) ایک ایسی مملکت جس میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود قرآن کریم کی رُو سے متعین ہوں۔

(۲) جس میں کوئی قانون ایسا نہ ہو جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو۔

(۳) جس میں تھیاکریسی۔ یعنی مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری کا کوئی سوال نہ ہو۔

(۴) جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۵) اور جس میں سرمایہ داری اور زمینداری کے غیر اسلامی نظام کو ختم کر دیا جائے۔

(۶) جس میں نہ مغرب کی بے لگام جمہوریت راہ پا سکے نہ روس کی سرمایہ غیر اشتراکیت — جس میں

نظامِ سیاست و معیشت بہرحال حدود اللہ کے تابع ہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کے لئے انگریز۔ ہندو اور خود مسلمانوں کے علمائے کرام کے خلاف جو مکھی لڑائی لڑی تھی۔ ہماری بدبختی یہی نہیں کہ ہم اس وقت تک پاکستان کو ان تصورات کے مطابق متشکل نہیں کر سکے۔ اس سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ خود یہ تصورات ہی رفتہ رفتہ قوم کی نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں عملی حصہ لیا۔ جنہیں قائدِ اعظم کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جنہوں نے ان کے ان ارشادات و بیانات کو اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے پڑھا لیکن یہ لوگ

یہ تصورات اوجھل ہو رہے ہیں

آہستہ آہستہ اُٹھتے چلے جائیں گے۔ ان کے بعد ہماری آنے والی نسلوں کو اتنا بتانے والا بھی کوئی نہیں ہو گا کہ پاکستان کیوں مانگا گیا تھا اور اس سے مقصود و مفہوم کیا تھا؟ کس قدر سنگین ہے ہمارا یہ جرم کہ ہم نے آج تک نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی ایسی مستند تاریخ مرتب کی ہے جس میں یہ مقاصد اُبھر کر سامنے آ جائیں اور نہ ہی قائدِ اعظم کی کوئی ایسی سوانح عمری مدون کی ہے جو ان کے ان تصورات کی آئینہ دار ہو۔

پھر یہی نہیں کہ ہم نے اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی سے مجرمانہ تغافل برتا۔ اس سے کہیں زیادہ تاسف انگیز اور جگر خراش یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اس نقصانِ عظیم کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہمیں اس کا احساس دلانے کے لئے باہر کے لوگ آتے ہیں جو آ کر ہم سے کہتے ہیں کہ

> میں نے ۲۰ سال پہلے، پاکستان کی حمایت میں قلم اٹھایا اور ایک دنیا میری مخالف ہوئی۔ لیکن میں نے پاکستان کی حمایت میں جو کچھ لکھا تھا اس کی صداقت پر مجھے اس لئے یقین تھا کہ میں جناح صاحب کو جانتا تھا۔
>
> اور آج اگر پاکستان کی نئی نسل کے دل میں پاکستان کی محبت کم ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نسل جناح سے واقف نہیں۔ (بیورلے نکلس کا ایک حالیہ بیان)

اور اپنی نئی نسل کو جناح سے ناواقف رکھنے کے ذمہ دار ہم خود ہیں ——— اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔ والسلام۔

(سوالات اور ان کے جوابات آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

سوالات

تقریر کے بعد، حسب معمول، سامعین کی طرف سے بہت سے سوالات پوچھے گئے۔ ان میں سے صرف چند ایک کے جوابات دئے گئے تھے کہ نماز کا وقت ہوگیا اس لئے باقی سوالات کی باری نہ آئی۔ یہ سوالات اور ان کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں۔ ان سے تقریر کے بعض نقاط کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔

پاکستان کے مخالفین

۱۔ سوال۔ آپ نے کہا ہے کہ بیشتر علماء حضرات نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ کیا آپ ان میں سے اہم شخصیتوں کے نام بتائیں گے؟

جواب۔ مستفسر صاحب نوعمر معلوم ہوتے ہیں، ورنہ جن حضرات نے تحریک پاکستان کو خود دیکھا ہے انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ مخالفت کن حضرات کی طرف سے ہوئی تھی۔ بہرحال، یہ حضرات دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک نیشنلسٹ علماء۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مفتی کفایت اللہ۔ مولانا احمد سعید (مرحومین) وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں مجلس احرار کے حضرات بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ دوسرا گروہ جماعت اسلامی والوں کا تھا جو ایک طرف متحدہ قومیت کے بھی خلاف تھے اور دوسری طرف مطالبۂ پاکستان کے بھی مخالف۔ ان کی یہ پالیسی کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔[1]

کافرانہ حکومت

۲۔ سوال۔ آپ نے کہا ہے کہ کسی نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں مسلمانوں کی کافرانہ حکومت قائم ہوگی۔ یہ کون صاحب تھے۔؟

جواب۔ جب آپ کریدکر پوچھنا چاہتے ہیں تو مجھے مجبوراً نام لینا پڑتا ہے۔ یہ صاحب تھے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ ان کا یہ قول ان کی کتاب، سیاسی کشمکش (حصہ سوم) میں موجود ہے۔

۳۔ سوال۔ کیا واقعات نے بتا نہیں دیا کہ ان کا کہنا بالکل بجا تھا؟

جواب۔ اس سوال کا جواب تفصیل چاہتا ہے۔ جس کے لئے وقت نہیں۔ میں اس وقت صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب

---

[1] اس میں سمجھ میں نہ آنے والی بات کونسی تھی؟ نیشنلسٹ علماء کے گروہ کی قیادت مولانا آزاد (مرحوم) کے حصہ میں آئی تھی اس لئے مودودی صاحب ان میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ مطالبۂ پاکستان کی حمایت کرنے والوں کی لیڈرشپ، جناح صاحب کے ہاتھ میں تھی اس لئے مودودی صاحب ان کے ہم نوا نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ اپنی امارت رہتی ہے۔ بدقسمتی سے اس کی گنجائش نہ اُدھر تھی نہ اِدھر۔ اس لئے یہ دونوں کے مخالف تھے۔ (طلوع اسلام)

انہیں معلوم تھا کہ پاکستان یعنی کافرانہ حکومت" قائم ہوگی تو وہ اس کافرانہ حکومت میں پناہ لینے کے لئے کیوں آ گئے؟[1] کیا کسی مومن کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ کافرانہ حکومت میں آکر پناہ لے؟ مومن کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اگر سوءِ اتفاق سے کبھی کافرانہ حکومت میں گھر جائے تو اس کے لئے خدا کا حکم ہے کہ وہ وہاں سے ہجرت کر جائے۔

۴ **سوال**۔ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کافرانہ حکومت کو اسلامی حکومت بنا دیا جائے۔

جواب۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ پاکستان کی مملکت بن جانے دیجئے پھر اسے اسلامی حکومت بنالیا جائے گا۔ یہ اس کا کیا جواب دیتے تھے، یہ انہی کے الفاظ میں سنئے۔ کہتے تھے۔

> بعض لوگ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ۔ سیاست اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے ——— تو میں اس کو معجزہ سمجھوں گا۔
>
> (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم)

فرمایئے کہ جو بات خود ان کے نزدیک ناممکن تھی اب وہ ممکن کس طرح ہو جائے گی؟

۵ **سوال**۔ آپ نے لکھا ہے کہ قائد اعظم جو اصول دس سال تک دہراتے رہے، پاکستان بننے کے بعد وہ ان کی خلاف ورزی کس طرح سے کر سکتے تھے؟ اگر وہ ایسا کر لیتے تو اس میں کیا ہرج تھا کیونکہ مودودی صاحب نے بتایا ہے کہ خود نبی کریم نے جو اصول اپنی تنظیم کے زمانے میں پیش فرمائے تھے، مدینہ کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد انہیں بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

اصول پرستی

جواب۔ عزیز من! اگر مودودی صاحب کو حضور رسالتمآب کی طرف اس قسم کی بات منسوب کرنے کی جرأت، اور آپ کو اسے صحیح تسلیم کر لینے کی تاب ہے، تو آپ دونوں کو مبارک! یہاں جو تو حضور ختمی مرتبت کی شانِ اقدس و اعظم میں اس قسم کی گستاخی کے تصور سے بھی لرزہ اٹھتا ہے۔ اس سے میری روح کانپتی ہے۔ میرا سینہ شق ہو جاتا ہے۔ خدا کے لئے آپ تو یہ الفاظ اپنی زبان پر نہ لایئے۔

---

[1] انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت، اسلامی نقطۂ نظر سے، غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے؟" ظاہر ہے کہ ان کے اپنے ارشاد کے مطابق ہندوستان کی کافرانہ حکومت پاکستان کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں بہتر تھی، پھر یہ وہاں سے بھاگ کر یہاں کیوں آ گئے؟ ان سے کہیں بہتر کردار کا ثبوت تو نیشنلسٹ علمائے دیا جو ہندوستان میں رہے اور وہیں وفات پائی۔ (طلوع اسلام)

آپ کیوں دنیا کی روسیاہی اور آخرت کی ذلت خرید رہے ہیں؟

آزادی اور پابندی کے حدود

۶ سوال۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ قرآن شریف ہماری آزادی اور پابندی کے حدود مقرر کرتا ہے اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب۔ قرآن کریم ہمیں زندگی کے غیر متبدل اصول دیتا ہے۔ ہم اس باب میں آزاد ہیں کہ ان اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے مسائل کا حل دریافت کریں اور ان کے مطابق اپنا نظام چلائیں۔ یہ ہماری آزادی ہے۔ لیکن ہم ان اصولوں کو کسی صورت میں بھی توڑ نہیں سکتے۔ یہ ہماری پابندی ہے۔

۷ سوال۔ کہتے ہیں کہ آپ ماڈرن اسلام رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اس اسلام کی تشریح کیجئے۔

اوریجنل اسلام

جواب۔ میں ماڈرن اسلام نہیں بلکہ وہ اوریجنل اسلام رائج کرنے کا متمنی ہوں جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ میں رائج تھا۔ اس اسلام کا دستور اساسی خدا کی کتاب تھی۔ وہ دلیل و برہان کی رو سے پیش کیا جاتا اور علم و بصیرت کی بنا پر مانا جاتا تھا۔ یہی واضح رہے کہ اسلام دنیا کے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے اس میں "قدیم" اور "جدید" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نہ اس میں عمر رفتہ کی حیات سے بیزاری
نہ اس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں!
حقائق ابدی پر مدار ہے اس کا
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں

انسان نے کیا سوچا؟

انسانی فکر کی دو ہزار سال کی تاریخ ہے جسے نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا گیا ہے اور جس سے انسان غیر شعوری طور پر عقل اور وحی کے صحیح مقامات سے شناسا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اس قسم کی کتاب نہیں ملے گی۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت پونے پانچ سو صفحات۔

قیمت۔ بارہ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کے مہینہ کا آغاز ہو چکا ہے اس لئے (معمول کے مطابق[1]) قرآن کی رو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ یہ احکام سورۃ البقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۔

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔

(۴) اور جو لوگ بہ دشواری روزے رکھ سکیں ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

(۵) اس کے بعد اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ....

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

---

[1] ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔ (۲/۱۸۵)

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ (۲/۱۸۷)

(۸) اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ (۲/۱۸۷)

(۹) اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)

(۲) روزے میں اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

(۳) روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

(۴) اب ایک مشکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے مکروہ اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں رکھ کر گنتی پوری کرے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت بالا میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمایئے اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا ترجمہ "وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں" کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں" کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں

رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۴۲۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۲۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

> طاقت، قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

> اِطَاقَةٌ دراصل مُكْنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّيْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں۔ جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی بہ دشواری اسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو انہی کی طرح معذور ہیں۔ مثلاً ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت، قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ۔

> طَاقَةٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بمشقت کیا جا سکے اور وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ ترک کر دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے۔ منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ جلد ۱)۔

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ۔

> عربی زبان میں اَلْوُسْعُ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَةٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیرِ نظر) کے معنی یہ ہوں گے کہ ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔
>
> (روح المعانی صفحہ ۵۹ جلد ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ طَاقَةٌ کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ

کا ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــــ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ـــ جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے اُمت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے چنانچہ عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان باب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۶۸۔ ۲۶۹ - جلد ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ سے یہاں مراد بوڑھے ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اچھا ہونے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں۔ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت، ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔

(تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵۔ ۱۵۷ جلد ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

(۱) بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

(۲) حاملہ عورتیں۔

(۳) دودھ پلانے والی عورتیں۔

(۴) اپاہج اور معذور لوگ۔

(۵) پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔

(۶) ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (CONSTITUTIONALLY) کمزور پیدا ہوئے ہیں۔

(۷) وہ مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔

(۸) وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ، اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بمشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۃ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵)۔

مُفت

مجرب دوا۔ برائے دمہ درد گردہ وپتھری

ملنے کا پتہ

حاجی محمد دین شیخ اینڈ فیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ کراچی

نوٹ: جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

مجلسِ اقبالؒ

(مثنوی۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق) ـــ

مسلسل (۴)

سابقہ قسط میں "خطاب بہ مہرِ عالمتاب" کا عنوان سامنے آچکا ہے جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ نوعِ انسان کے لئے نجات و سعادت کی راہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے معاملات کا حل وحی کی روشنی میں تلاش کرے۔ اور وحی سے استفادہ کی شرطِ اولین یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن سے غیر قرآنی خیالات اور تصورات کو نکال دے۔ اس کے بعد دو عنوانات ہیں "قرآنی نظامِ زندگی اور غیر قرآنی نظام کا تقابل ہے۔ اول الذکر کو حکمتِ کلیمی سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخر الذکر کو حکمتِ فرعونی سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں حق و باطل کی کشمکش اسی دن سے جاری ہے۔ جس دن خدا کی طرف سے سلسلۂ ہدایت شروع ہوا۔ لیکن صاحب ضربِ کلیم حضرت موسےؑ اور فرعون کی باہمی آویزش اس کشمکش کی بڑی تفصیلی داستان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا ہے۔ نظامِ خداوندی کی مخالفت ہمیشہ مفاد پرست طبقات کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ طبقات بہ حیثیت مجموعی تین حلقوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں ـــ ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت۔ حضرت موسیٰؑ کے مدِ مقابل یہ تینوں قوتیں متحدہ محاذ بنا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ، فرعون۔ مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ہامان۔ اور نظامِ سرمایہ داری کا نقیب۔ قارون۔ علامہ اقبالؒ نے اسی وجہ سے "حق اور باطل کے نظام کے موازنہ کے لئے اس کشمکش کو زیبِ عنوان بنایا ہے ـــ ایک طرف وہ نظام ہے جو وحی کے غیر متبدل اصولوں کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ نظام ہے جسے انسان کی مفاد پرستیاں" وجود میں لاتی ہیں۔ پہلے نظامِ خداوندی کی خصوصیات سامنے آتی ہیں جس کا عنوان ہے۔

حکمتِ کلیمی

سلسلۂ کلام کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

تا نبوت حکمِ حق جاری کند — پشت پا بر حکمِ سلطاں می زند

دین کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جاسکتی ہے کسی غیر خداوندی قوت کی نہیں جملہ اقتدار و اختیار صرف خدا کے لئے ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے مفہوم ہی یہی ہے۔ نبی کو خدا کی طرف سے احکام ملتے تھے، اور اس کا فریضہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ان احکام کو دنیا میں عملاً نافذ کرے۔ اس لئے، سب سے پہلے اس کا ٹکراؤ، ملوکیت کے ساتھ ہوتا تھا۔ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت نہیں۔ اس سے مراد ہر وہ نظامِ سیاست ہے جس میں غیر اللہ کے احکام جاری ہوں — وہ بادشاہت ہو یا آمریت۔ جمہوریت ہو یا نظامِ پیشوائیت — نبوت، ان سب کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی تھی اور انسانوں کو ہر نوع غلامی سے آزاد کراتی تھی۔ نبوت نبی اکرمؐ کے بعد ختم ہوگئی لیکن احکامِ خداوندی قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ حضورؐ کے بعد اُمتِ مسلمہ کا فریضہ تھا کہ وہ ہر غیر خداوندی نظام کو مٹا کر دنیا میں احکامِ خداوندی کو نافذ کرتی لیکن انہوں نے خود اپنے ہاں ہر اس نظام کو رائج کر لیا جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جسے نبی اکرمؐ نے عملاً مٹا کر دکھا دیا تھا — ملوکیت — سرمایہ داری — مذہبی پیشوائیت۔ ایک ایک کر کے اس اُمت کے نظامِ زندگی کے جزو بن گئے اور اب تک بنے چلے آرہے ہیں نبوت یعنی نظامِ خداوندی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

در نگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر — غیرتِ او بر نتابد حکمِ غیر

غیر خداوندی نظام، اس کی نگاہوں میں ایک بت خانہ ہوتا ہے۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ انسان، خدا کے علاوہ کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے۔ نظامِ خداوندی کی غیرت اسے گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے حکم کے سامنے گردن جھکا دے۔

اس مقصد کے لئے نبی اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے ایک ایسی جماعت تیار کرتا ہے جو ہر نظامِ باطل سے ٹکر لیتی ہے۔

پختہ سازد صحبتش ہر خام را — تازہ غوغائے دہد ایام را

اس کی تعلیم و تربیت، ہر ناپختہ انسان کو پختہ بنا دیتی ہے۔ اور دنیا میں ایک نئے انقلاب کی روح پھونک دیتی ہے — نبی صرف وعظ کہنے کیلئے نہیں آتا۔ وہ ایک صالح انقلاب برپا کرنے کے لئے آتا ہے۔

درس او اللہ بس۔ باقی ہوس — تا نہ خیزد مردِ حق در بند کس

اس کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہیٰ یہ ہوتا ہے کہ حکمران و فرمان روائی صرف خدا کے لئے ہے۔ اس کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اور اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

از دمِ او آتش اندر شاخِ تاک — در کفِ خاک از دمِ او جانِ پاک

اس کی تربیت سے، انگور کی نرم و نازک شاخوں میں، آتشِ سیّال موجزن ہوجاتی ہے۔ کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہوجاتا ہے۔ انسانیت کی عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑنے لگ جاتا ہے۔ آب و گِل کے پیکرِ انسان، زندگی اور حرارت کے برق پارے بن جاتے ہیں۔ عرب کی اونٹ چرانے والے اور کھجور کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی قوم، اقوامِ عالم کی امامت کی سزاوار بن جاتی ہے —— یہ ہوتا ہے نبی کی تعلیم و تربیت کا اثر!

معنیٔ جبریل و قرآں است او | فطرۃ اللہ را نگہباں است او

وحی کی کنہ و ماہیت کو ہم جان نہیں سکتے —— نبی کے سوا اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ خدا نے کہا کہ ہماری وحی کو جبریلؑ قلبِ محمدیؐ پر نازل کرتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو کچھ نہیں سکتے تھے۔ لیکن جب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ ہے وہ قرآن جسے خدا کی طرف سے جبریلِ امین لے کر مجھ پر نازل ہوئے ہیں، تو ہم نے سمجھ لیا کہ وحی کسے کہتے ہیں۔

پھر رسول کا فریضہ اتنا ہی نہیں کہ وہ خدا کی وحی لوگوں تک پہنچا دیتا ہے اور بس۔ وہ (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ کا کام نہیں کرتا کہ چٹھی مکتوب الیہ تک پہنچا دی اور چلا گیا۔ نبی، خدا کے پیغام کو دنیا میں عملاً نافذ کرتا اور اس طرح دینِ خداوندی کی نگہبانی کرتا ہے۔

حکمتش برتر ز عقلِ ذوفنون | از ضمیرش اُمتے آید بروں

وحی کا سرچشمہ، عقلِ انسانی سے ماوراء ہوتا ہے۔ وحی انسانی عقل و فکر کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اس میں کسب و ہنر کو دخل ہی نہیں ہوتا۔ یہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ البتہ ہم اس کے مطالب کو عقل و بصیرت سے سمجھ سکتے ہیں۔

نبی اس وحی کو عام کرتا ہے، اور جو لوگ اس کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لاتے ہیں انہیں ایک برادری کے رشتہ میں منسلک کرتا جاتا ہے۔ اس طرح وہ امت وجود میں آجاتی ہے جو وحی کے مطابق انقلاب برپا کرتی ہے۔ یاد رکھئے! امت، نبی کی نسبت سے وجود میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم، تمام انبیائے سابقہؑ پر ایمان رکھنے کے باوجود، جملہ امم سابقہ —— یہود، نصاریٰ وغیرہ سے الگ، ایک مستقل امت ہیں۔ اس امت کا فرد وہی ہو سکتا ہے جو تمام انبیائے سابقہؑ پر ایمان لانے کے ساتھ محمدؐ رسول اللہ پر بھی ایمان لائے۔ جو حضورؐ پر ایمان نہیں لاتا وہ اس امت کا فرد نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص، نبی اکرمؐ کے بعد کسی اور کو نبی تسلیم کرتا ہے تو وہ اس (نئے) نبی کی اُمت کا فرد ہو جائے گا۔ اُمتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہے گا۔ بعینہٖ جس طرح ایک عیسائی جب نبی اکرمؐ پر ایمان لے آئے تو وہ اُمتِ حضرت عیسیٰؑ کا فرد نہیں رہتا۔ اُمتِ محمدیہ کا فرد ہو جاتا ہے۔

جو حکومت وحی کی رو سے قائم ہوتی ہے، اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج | بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

اُس میں جس شخص (یا جس ادارہ) کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہوتی ہے، اس کی حیثیت حاکم اور فرمانروا کی نہیں ہوتی۔ اس کی حیثیت، احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے والے کی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی ان احکام کی اطاعت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی انہی احکام

کی اطاعت کرتا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں ۔۔۔ بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج ۔۔۔ سے یہ مطلب نہیں کہ اس حکومت میں نہ فوج ہوتی ہے، نہ حکومت کی کوئی آمدنی۔ اس حکومت میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ، حاکم کی منشاء کو پورا کرنے یا اس کے مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ سب قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں کلاہ و سپاہ و خراج "حکمران" کے لئے نہیں ہوتے۔ حکومتِ خداوندی کے لئے ہوتے ہیں۔

از نگاہش فرودیں خیزد ز دے   دُردِ ہر خُم تیز تر گردد ز مے

وہ صرف احکامِ خداوندی کو میکانکی طور پر نافذ نہیں کرتا۔ وہ افرادِ امت کی تربیت بھی کرتا ہے۔ ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی خزاں دیدہ شاخوں پر از سرِ نو بہار آجاتی ہے اور تلچھٹ میں بھی شرابِ خالص کی سی تندی اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت سے کم صلاحیتوں والے افراد بھی بلندیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔

اندر آہِ صبحگاہِ او حیات   تازہ از صبحِ نمودش کائنات

اس کا دلِ دردمند نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر گریہ و زاری کرتا اور بحضورِ رب العزت دعائیں مانگتا ہے۔ اس کی اس دردمندی اور بہی خواہی میں قوم کی زندگی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اس کا ظہور پوری کائنات کو تازگی عطا کر دیتا ہے۔

یہ اس کی سیرت کا جمالی پہلو ہے۔ دوسری طرف

بحر و بر از زورِ طوفانش خراب   از نگاہِ او پیامِ انقلاب

ظلم و استبداد کی ہر قوت، اس کے جلال و سطوت سے لرزہ براندام ہوتی ہے۔ وہ سیلِ رواں کی طرح اٹھتا ہے اور باطل کی ہر قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ کائنات کے گوشے گوشے کو پیامِ انقلاب سے آشنا کر دیتا ہے۔

درسِ لاخوف علیہم می دہد   تا دلے در سینۂ آدم نہد

وہ انسان کے سینے میں ایک زندہ اور پایندہ دل رکھ دیتا ہے، جو دنیا کی کسی قوت سے نہیں دبتا۔ وہ خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا اور اس طرح ہر قسم کے خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے۔

عزم و تسلیم و رضا آموزدش   در جہاں مثلِ چراغ افروزدش

وہ انسانوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور اس کے بعد اپنے اندر ایسا عزمِ محکم پیدا کریں کہ یہی قوانین، تمام عالمِ انسانیت کا ضابطۂ حیات بن جائیں ۔ اس طرح ان انسانوں کی سیرت و کردار اور علم و بصیرت کی روشنی سے ساری دنیا منور ہو جائے۔

من نمیدانم چہ افسوں می کند روح را در تن دگرگوں می کند

معلوم نہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کیا افسوں پھونکتی ہے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائیوں میں عظیم انقلاب پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح یہ افراد کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

صحبتِ او ہر خزف را دُر کند حکمتِ او ہر تہی را پُر کند

اس کی صحبت سے، خزف ریزے بھی لعل و گہر بن جاتے ہیں۔ اسکی وحی پر مبنی تعلیم سے، انسانی دلوں کے خالی پیالے علم و بصیرت سے پُر ہو جاتے ہیں۔

بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز ہر کہن معبود را کن ریز ریز

وہ کمزور و ناتواں انسانوں کو پیغامِ انقلاب دیتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ اٹھو! اور باطل کی جن قوتوں نے انسانوں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر رکھا ہے ان کی کمر توڑ دو۔ ان تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر دو۔

اس کے بعد اقبالؒ تفصیل سے بتاتا ہے کہ تعلیم نبوی بندۂ مومن کو کیا سبق دیتی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ

مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن از دو حرفِ ربی الاعلیٰ شکن

مومن کا ایمان یہ ہے کہ ربی الاعلیٰ۔ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہے۔ کبریائی اور حکومت اسی کے لئے ہے۔ وہ سب سے بلند و بالا ہے۔ اس لئے انسانی دنیا میں فرمان روائی صرف اس کے قانون کی ہونی چاہیئے۔ یہی وہ انقلابی آواز ہے جس سے مردِ مومن باطل کے ہر طلسم کو توڑ دیتا ہے۔

فقر خواہی از تہیدستی منال عافیت در حال و نے در جاہ و مال

اگر کبھی حالات ناسازگار ہو جائیں تو چیخنا چلانا مت شروع کر دو۔ ہمت سے کام لو۔ یاد رکھو! امن و عافیت، مال اور مناصب سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس کا تعلق انسان کی کیفیتِ قلب سے ہے۔ اگر اس میں صحیح نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے (جو ایمان کا فطری نتیجہ) ہے تو وہ ناسازگار حالات سے گھبراتا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ

صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد نے زر و سیم و قماشِ سرخ و زرد

اور دل کی کیفیت، ان صفاتِ حسنہ سے پیدا ہوتی ہے جو مومن کا شعارِ زندگی ہیں۔ یہ چیز مال و دولت سے حاصل نہیں ہوتی۔

بگذر از کاؤس و کے اے زندہ مرد طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد

حکمرانوں کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرنا اور اربابِ دولت کے محلات کا طواف کرنا۔ وجۂ ننگِ انسانیت ہے۔ تم اپنی خودی کو بیدار اور مستحکم کرو۔ ساری دنیا تمہارے سامنے جھکے گی۔ حقیقی قوت، سیرت اور کردار کی بلندی میں ہے۔

از مقامِ خویش دور افتادۂ کرگسی کم کن کہ شاہیں زادۂ

علامہ اقبالؒ، عصر حاضر کے مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو اپنے بلند و برتر مقام سے بہت دور جا پڑا ہے۔ تو شاہین بچہ ہے۔ تیرا کام، زندہ شکار کرنا ہے۔ تو چیلوں اور گدھوں کی طرح مردہ لاشوں پر کیوں منڈلا رہا ہے۔

مرغک اندر شاخسارِ بوستاں — بر مرادِ خویش بندد آشیاں
تو کہ داری فکرتِ گردوں مسیر — خویش را از مرغکے کمتر مگیر

ایک چھوٹی سی چڑیا بھی جب باغ میں گھونسلا بنانا چاہتی ہے تو وہ اپنی منشا کے مطابق شاخِ آشیاں کا انتخاب کرتی ہے اور پھر اپنی مرضی کے مطابق اپنا گھر بناتی ہے۔ اے مردِ مسلماں! تیری فکر تو نہ آسمان سے بھی آگے جانے والی ہے۔ تیرا مقام اس قدر بلند ہے۔ تو اپنے آپ کو اس چڑیا سے بھی کمتر سمجھ رہا ہے۔ تو غلامی اور محکومی پر ایسا رضامند ہو چکا ہے کہ تیری ساری زندگی غیروں کے اشارے کے تابع بسر ہوتی ہے۔

دیگر ایں نہ آسماں تعمیر کن — بر مرادِ خود جہاں تعمیر کن

اٹھ۔ اس جہانِ مستعار کو پھونک دے۔ اور اپنے لئے اپنی منشا و مقصود کے مطابق ایک نئی دنیا تعمیر کر۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود — بندۂ مومن قضائے حق شود

جب بندۂ مومن اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیتا ہے تو اسے اس قدر غلبہ و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کے فیصلے، دنیا میں خدا کے فیصلوں کی طرح نافذ اور رائج ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فیصلہ ہی وہی کرتا ہے جو قانونِ خداوندی کا تقاضا ہو۔

چار سوئے با فضائے نیلگوں — از ضمیرِ پاک او آید بروں۔

اس سے یہ کائنات ایک نئے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اس کا پاکیزہ قلب، اس خارجی دنیا کو اس طرح متاثر کر دیتا ہے کہ اس میں خباثت کا نام و نشان تک نہیں رہتا۔ لہٰذا!

در رضائے حق فنا شو چوں سلف — گوہرِ خود را بروں آر از صدف

جس طرح عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مومنین نے اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی سے یکرنگ کر لیا تھا، اسی طرح تم بھی کرو۔ اور یوں اپنی خودی کو مستحکم کر کے، گوہرِ آبدار کی طرح دنیا میں درخشندہ و تابندہ زندگی بسر کرو۔

در ظلامِ ایں جہانِ سنگ و خشت — چشمِ خود روشن کن از نورِ سرشت

اس جہانِ تیرہ و تار میں، وحی کی قندیل سے، اپنا راستہ بھی روشن کرو، اور باقی دنیا کی بھی راہبری کرو۔

تا نہ گیری از جلالِ حق نصیب — ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

لیکن یہ یاد رکھو، کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے اندر پوری پوری قوت بیدار کرو۔ قوت کے بغیر زندگی کی آسائشیں

نصیب نہیں ہو سکتیں۔ لیکن قوت ہو یا زندگی کی آسائشیں۔ یہ سب قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل اور صرف کرنی چاہئیں۔

ابتدائے عشق و مستی قاہری است   انتہائے عشق و مستی دلبری است

مومن کے لئے غلبہ و اقتدار نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ غلبہ و اقتدار مقصود بالذات نہیں۔ اس سے باطل کی قوتوں کو زیر کرکے، دنیا میں ایسا نظامِ عدل و احسان قائم کرنا مقصود ہے، جس کی طرف ساری دنیا کشاں کشاں چلی آئے اور وہ تمام عالمِ انسانیت کا محبوب و مطلوب بن جائے۔

مردِ مومن از کمالاتِ وجود   او وجود و غیرِ او ہر شے نمود۔

حقیقی زندگی استحکامِ خودی سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر خودی مستحکم نہیں تو پھر زندگی کی محض نمود و نمائش ہوتی ہے حقیقی زندگی حاصل نہیں ہوتی۔

گر بگیرد سوز و تاب از لا الہ   جز بکامِ او نگردد مہر و مہ

اور جب انسان، صرف ایک خدا کے قوانین کے سامنے جھک کر اپنی خودی کو مستحکم کر لے، تو خارجی کائنات کی تمام قوتیں اس کے تابع فرمان، اور اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

یہ اس عنوان کا آخری شعر ہے۔

دمہ کے مریض متوجہ ہوں

ہم نے دمہ کے لئے "ایزموفابیڈین" نامی دوا تیار کی ہے۔ جو کہ ٹکیوں کی شکل میں ہے۔ دمہ کے کئی مریض اور ڈاکٹر صاحبان نے بھی یہ دوا پسند کی ہے۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دوائی کی وسیع تشہیر اور دمہ کے عام مریضوں کی بھلائی کے لئے ۶ ٹکیوں کا پیکیٹ بطور نمونہ مریضوں میں بلاقیمت تقسیم کیا جائے تاکہ مریض خود استعمال کرکے دیکھ لیں۔ اگر فائدہ مند ثابت ہو تو ہم سے براہِ راست منگوا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دوا بازار سے بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔ خواہشمند حضرات ٹکیوں کا نمونہ منگوانے کے لئے اپنا نام اور پورا پتہ ہمیں درج ذیل پتہ پر لکھیں۔

این۔ ایچ۔ شاہانی اینڈ کمپنی — شاہانی مینشن

ماڈل ٹاؤن روڈ لائلپور۔ (مغربی پاکستان)

کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں؟

شیخ الازہر علامہ محمود شلتوت

مترجم۔ سید نصیر شاہ میانوالی

(ذیل کا مضمون شیخ الازہر، شیخ الاسلام، مفتی الدیار المصریہ العلامہ الاستاذ محمود شلتوت صاحب کے ایک فاضلانہ فتویٰ کا ترجمہ ہے۔ یہ فتویٰ، کتاب الفتاویٰ مطبوعہ از ہر دسمبر ۱۹۵۹ء کے صفحات ۵۲ تا ۵۸ پر درج ہے ——— طلوع اسلام)

جامعہ ازہر کی مجلس علماء کو مشرق وسطیٰ کی فوجی قیادت عامہ کے ایک ممتاز رکن جناب عبدالکریم خان کی طرف سے ایک استفتاء موصول ہوا ہے۔ جس کی عبارت درج ذیل ہے۔

استفتاء (ا) کیا کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ کی تصریحات کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پاگئے ہیں؟

(ب) تائید اگر عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے کا منکر ہے تو علمائے کرام کا اس پر کیا فتویٰ ہے؟

(ج) نیز ایک شخص اگر ان کے دوبارہ نزول کا منکر ہو تو اس کے متعلق کیا فیصلہ ہے؟ کیا اسے کافر کہا جا سکتا ہے؟

جامعہ ازہر کی مجلس علمائے اس سوال کا جواب دینے کا فریضہ مجھ پر عائد کیا۔ میں نے اسی وقت اس استفتاء کا جواب دیا تھا جو مصر کے معروف ماہنامہ الرسالۃ کی جلد نمبر ۱۰ میں شائع ہو چکا ہے۔ وہاں سے بعینہٖ اس فتویٰ کو نقل کر کے مجموعۂ فتاویٰ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

قرآن حکیم اور مسئلۂ وفات عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انجام قرآن حکیم میں تین مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے۔

(۱) سورۂ آل عمران میں خدائے قدوس کا ارشاد ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

پھر جب عیسیٰؑ نے ان سے کفر محسوس کیا تو فرمایا کون ہے جو اللہ کے دین کے معاملہ میں میری مدد کرے۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل کیا اور ہم نے رسول کی اتباع کی پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ۔ اور کافروں نے تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے اچھا ہے۔ جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں اور تجھے ان کے الزام سے پاک کرنے والا ہوں جو کافر ہیں اور جنہوں نے تیری پیروی کی انہیں ان پر جنہوں نے انکار کیا قیامت کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں پھر میری طرف تمہارا لوٹ آنا ہے پس میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے (۳/۵۴ تا ۵۵)

(۲) دوسری جگہ سورہ النساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۔ (۴/۱۵۷ تا ۱۵۹)

اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب دی مگر وہ ان کے لئے اس جیسا بنا دیا گیا اور بے شک وہ لوگ جنہوں نے اس کے متعلق اختلاف کیا اس بارے میں شک میں ہیں ان کو اس کا کچھ علم نہیں۔ صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور انہوں نے اسے یقینی طور پر قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنا قرب عطا فرمایا۔

(۲) تیسرے مقام پر سورہ مائدہ میں ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (۵/۱۱۶ — ۱۱۷)

اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ "مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بنا لو"؟ کہا "تو پاک ہے مجھے کہاں زیبا تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے حق نہیں اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے اس کا ضرور علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے اور میں ان پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان میں تھا پھر تو نے مجھے وفات دے دی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

قرآن حکیم میں محض مذکورہ بالا تین مقامات پر حضرت مسیحؑ کے انجام کا ذکر ہوا۔ سورۂ مائدہ کی آیت اس گفتگو کو بیان کرتی ہے جو محشر کے روز حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی عبادت کرنے والوں کی تردید میں ہوگی۔ سلسلۂ کلام میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہیں گے کہ "کیا نصاریٰ کو تو نے ہی کہا تھا کہ وہ تیری اور تیری ماں کی عبادت اختیار کریں"۔ مسیح علیہ السلام عرض کریں گے "میرے خدا! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے تیری توحید کا پیغام پہنچایا تھا ہاں جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا ان کا نگران تھا۔ البتہ مجھے اپنی وفات کے بعد وقوع پذیر ہونے والے حالات کا علم نہیں۔

اس آیت میں فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے الفاظ صراحت کر رہے ہیں کہ مسیح کی وفات ہو چکی۔ یہاں اس امر کی قطعاً گنجائش نہیں کہ اس وفات سے مسیح علیہ السلام کے آسمان سے اترنے کے بعد کی وفات مراد لی جائے۔ کیونکہ جو لوگ ہنوز حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر زندہ گمان کرتے ہیں ان کا بھی یہی خیال ہے کہ نزول کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی وفات اس وقت ہوگی جب حق کا غلبہ ہوگا اور باطل اپنی شکست کی آواز بن کر رہ جائے گا۔ یہ وفات گویا قرب قیامت کے وقت ہوگی جبکہ بعد متبعین مسیحؑ کے شرک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ آیت حضرت مسیحؑ اور ان کی قوم کے تعلق کی حد بندی کر رہی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو محیط نہیں ہو سکتی جو آخری زمانے میں ہوں گے کیونکہ وہ تو آنحضرت صلعم کی قوم کے لوگ ہوں گے نہ کہ مسیحؑ کی قوم کے۔

ایک اور طرح سے دیکھئے تو بھی یہ آیت حضرت مسیحؑ کی وفات کو قطعیت کے ساتھ ثابت کر رہی ہے کیونکہ اس آیت میں عیسائیوں کے عقائد بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد بیان کیا گیا ہے اور چونکہ وہ نزولِ قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا اس لئے حضرت عیسیٰؑ کی وفات بھی نزولِ قرآن سے پیشتر ہو چکی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ سرورِ کائنات صلعم نے فرمایا کہ جب قیامت کے روز میری امت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا "تو نہیں جانتا کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کیا۔

فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۔

میں وہی بات کہوں گا جو عبدِ صالح (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہی تھی اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا۔

حضور صلعم کا حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپ کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی امت بھی ان کی وفات کے بعد بگڑی اور اسی طرح آپؐ کی امت آپ کی وفات کے بعد بگڑے گی۔

تَوَفّیٰ کے معانی

ان تصریحات کے بعد لفظ توفّیٰ کے معانی پر غور کیجئے۔

قرآن حکیم میں توفّی کا لفظ بکثرت وفات کے معنوں میں وارد ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ توفّی سے موت کے معانی متبادر سمجھے جاتے ہیں۔ اور جب تک اس لفظ کے ساتھ کوئی اور قرینہ ایسا نہ ہو جو کسی دوسرے معانی پر دلالت کرے یہ لفظ موت کے معانی کے بغیر کسی اور معانی میں استعمال ہی نہیں ہوتا۔ سورہ سجدہ میں ہے۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ـــــ (۳۲)

کہ موت کا فرشتہ تمہاری روح قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

سورہ النساء میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ـــــ (۴۴)

جن لوگوں کی فرشتے جان قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔

سورہ انفال میں ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ ـــــ (۵۰)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں۔

سورہ انعام میں ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا ـــــ (۶۱)

یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو اللہ کے بھیجے ہوئے اسے وفات دے دیتے ہیں۔

اسی طرح تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ، حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ، وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وغیرہ آیات میں توفی صراحت سے موت کے معنوں میں آیا ہے اس لئے تَوَفّٰی کا کوئی اور مفہوم لینا خلاف قاعدہ ہے۔ لغت میں بھی تَوَفَّاهُ اللہ کے معنی قَبَضَ رُوْحَهٗ لکھے گئے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت مذکورۃ الصدر میں یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ کے معانی کسی عربی دان سے پوچھئے وہ صاف طور پر یہی مفہوم بیان کرے گا کہ "اے عیسیٰ میں تجھے موت دوں گا"۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ روایات کو مدنظر رکھ کر اس کا وہ عجیب و غریب مفہوم بیان کر ڈالے جس پر علم ماتم کرتا ہے اور عربیت سینہ پیٹتی ہے۔ خود بخاری شریف میں ابن عباسؓ نے اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ کے معنی کئے ہیں۔ اِنِّیْ مُمِیْتُكَ (میں تجھے موت دوں گا)۔

اس تصریح کے بعد ہم آیات مذکورہ کے ایک اور لفظ "رفع" کا مفہوم متعین کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

رفعہ اللہ الیہ کے معانی اور روایات مضطربہ

سورۃ النساء کی آیت میں بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وارد ہوا ہے اکثر مفسرین نے اس میں رفع کی تفسیر آسمان کی طرف جانا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو مسیحؑ کی شبیہ بنا دیا اور مسیحؑ کو جسم سمیت آسمان پر اٹھا لیا وہ وہاں زندہ ہیں آخری زمانے میں اتریں گے سوروں کو مار ڈالیں گے اور صلیب توڑ دیں گے۔ مفسرین اس بارے میں اول تو ان روایات پر اعتماد کرتے ہیں جن میں دجال کے بعد نزول مسیحؑ کا ذکر ہے یہ روایات مضطربہ اپنے الفاظ اور معانی میں اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں تطبیق ممکن نہیں۔ اس امر کی تصریح خود علمائے حدیث نے کی ہے۔ مزید برآں یہ وہب بن منبہ اور کعب الاحبار کی روایات ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے تھے۔ علمائے جرح و تعدیل کے نزدیک ان راویوں کا جو درجہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مفسرین کی دوسری دلیل وہ روایت ہے جو ابوہریرہؓ سے مروی ہے اور جس میں انہوں نے نزول عیسیٰؑ کی خبر دی ہے اگر یہ حدیث صحیح بھی تسلیم کر لی جائے تب بھی یہ خبر واحد ہے اور علمائے امت کا اجماع ہے کہ خبر واحد سے نہ تو کوئی عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی امور غیبیہ کے بارے میں اس پر اعتماد کرنا درست ہے۔

مفسرین کی تیسری دلیل وہ بیان ہے جو حدیث معراج میں آیا ہے کہ جب آنحضرت صلعم نے آسمانوں کی طرف صعود کیا اور یکے بعد دیگرے آسمانوں کو کھولتے گئے تو دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰؑ اور ان کے خالہ زاد بھائی حضرت یحییٰؑ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دلیل کی عنکبوتیت خود اس کے بیان سے واضح ہے۔ تمام علماء تسلیم کرتے ہیں کہ معراج میں حضورؐ بہت سے انبیاء سے ملے اور یہ ملاقات محض روحانی تھی۔ اگر جسمانی ہوتی تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ اٹھائے گئے اسی طرح باقی انبیاء بھی زندہ اٹھائے گئے ہوں گے اور حضرت یحییٰؑ تو خصوصاً زندہ اٹھائے گئے ہوں گے کیونکہ وہ تو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ہی ملے تھے تو کیا ان تمام انبیاء کا پھر نزول ہوگا۔؟

یہاں مفسرین کی اس طرف بات کو بھی مدنظر رکھیے کہ جب وہ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ آیت قرآنی کا مفہوم بیان کرتے ہیں تو حدیث معراج

سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں چونکہ معراج میں حضورؐ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرے آسمان پر دیکھا اس لئے رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے معنی ہیں اللہ نے عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھا لیا۔ لیکن جب حدیث معراج کے سلسلے میں ان سے کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے دوسرے انبیاء کی طرح عیسیٰ علیہ السلام سے بھی روحانی ملاقات ہوئی ہو تو وہ جھٹ کہہ دیتے ہیں واہ جی! قرآن میں آ چکا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ گویا اس طرح یہ لوگ جب حدیث کی تشریح کرتے ہیں تو اپنے مزعومہ معانی پر آیت کو دلیل گردانتے ہیں۔ اور جب آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو حدیث کے مزعومہ مفہوم کو دلیل بنا لیتے ہیں کہ

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

رفع کی حقیقت

سورۂ آل عمران کی آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ۔ سورۂ نساء کی آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ سے ملا کر پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں وفات کے بعد رفع کا جو وعدہ کیا گیا تھا دوسری آیت میں اسی وعدے کے پورا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں وفات، رفع اور تطہیر کے وعدے تھے اگرچہ دوسری آیت میں وفات اور تطہیر کا بیان نہیں۔ صرف رفع الی اللہ کا ذکر ہے تاہم دونوں آیتوں میں تطبیق کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام وعدوں کو یہاں بھی مدنظر رکھا جائے پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو وفات دی پھر رفع فرمایا اور انہیں کافروں کے الزامات سے معصوم ثابت کیا۔

ماضی قریب کے مشہور مفسر علامہ آلوسی نے مُتَوَفِّیْكَ کی جو متعدد تفسیریں بیان کی ہیں ان میں سے واضح ترین یہی معنے ہیں کہ میں تیری مدت عمر کو پورا کروں گا اور تجھے طبعی موت سے وفات دوں گا۔ تجھ پر کوئی ایسا شخص مسلط نہ ہو گا جو تجھے مقتول یا مصلوب کر سکے۔ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ۔ کا یہی مفہوم ہے جو شخص قتل نہ ہو اور نہ ہی صلیب پر لٹکایا جائے یہ ضروری نہیں کہ اس کی موت سے بھی انکار کیا جائے۔ گویا آیہ مذکورہ میں بطور کنایہ بتا دیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ دشمنوں کے قتل کرنے سے محفوظ رہے اور اپنی عمر پوری کر کے طبعی موت سے فوت ہوئے

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ وفات کے بعد رفع سے صرف بلندئ درجات ہی مراد ہو سکتی ہے نہ کہ رفع جسمانی بالخصوص جبکہ آیت میں متصل بعد وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا فقرہ موجود ہے جو یہ ثابت کر رہا ہے کہ یہاں شرف واجتبا اور عظمت وتکریم کا ذکر مقصود تھا۔

قرآن حکیم میں لفظ رفع ان معانی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاءُ۔ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ ہم خود ہر روز دعا میں یہی کہتے ہیں وَارْفَعْنِیْ (یعنی اے خدا مجھے بلند درجہ عطا فرما) خدائے قدوس کا ایک صفاتی نام الرافع ہے اس کا مفہوم اہل لغت نے یہی بیان کیا ہے کہ وہ اپنے اولیاء کو اپنا قرب عطا فرما کر ان کے درجات بلند کرتا ہے انسان کا کسی اونچی جگہ پر چلا جانا خدا کے نزدیک بلندی نہیں نہ ہی خدا کوئی جسم ہے کہ وہ مقام بلند پر رونق افروز ہو۔

پس آیات رَافِعُكَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں وہی مفہوم ادا ہوا ہے جو آیات "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" اور "عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ" وغیرہ میں مراد ہے۔ ان سب مقامات پر حفاظت، نگرانی اور مقدس پناہ میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا۔ پھر لفظ اِلَيْهِ میں نہ معلوم مفسرین آسمان کا لفظ کہاں سے گھسیٹ لاتے ہیں۔ بجائے کتاب اللہ کے واضح اور غیر مبہم انداز بیان پر صریح ظلم محض ان قصوں اور روایتوں کی اتباع میں روا رکھا جا رہا ہے جن کی صحت پر یقینی طور پر تو کیا

عقلی طور پر کوئی دلیل یا نیم دلیل بھی قائم نہیں۔

آیات کا واضح اور غیر مبہم مفہوم

علاوہ بریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ایک رسول ہیں ان سے پہلے کے سب رسول وفات پا چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی قوم نے ان سے دشمنی کی اور ان کے بارے میں ان کے برے عزائم نمایاں تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی قوت و حکمت سے انہیں فسادیوں کے شر سے محفوظ رکھا اور دشمنوں کی خفیہ تدبیروں کو ناکام بنا دیا۔ یہی وہ مضمون ہے جو سورۂ آل عمران کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ایک دفعہ پھر ان آیات کا مطالعہ کیجئے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے یہی کچھ بیان فرمایا کہ خدا کی تدبیر کافروں کے تدبیروں کے مقابلے پر نہایت قوی اور زبردست ہوتی ہے۔ اس نے مسیح کو محفوظ رکھنے کی الٰہی تدبیر کے سامنے یہود کا مسیح کو قتل کرنے کا ناپاک منصوبہ اکارت گیا۔ آیت یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا میں۔ خدائے قدوس نے مسیح کو بشارت دی تھی کہ وہ انہیں دشمنوں کے شر سے مامون رکھے گا اور ان کے ذلیل منصوبے ناکام بنائے گا۔ وہ انہیں پوری عمر کے بعد طبعی وفات دے گا۔ اور ان کے درجات بلند کرے گا اس طرح وہ لوگ جو عیسیٰ کو صلیب کی ذلیل موت دینے کے درپے تھے اپنی نامرادی کا ماتم کرتے رہ جائیں گے۔

صلیب کی موت کو وہ لوگ مسلمہ طور پر لعنت خیال کرتے تھے کیونکہ استثناء ۲۱-۲۳ میں ہے "وہ جو مصلوب ہوتا ہے ملعون ہوتا ہے" اور گلیتون ۱۳-۳ میں پولوس کہتا ہے "لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے" چونکہ "لعنت" کے معنی ہیں خدا کی رحمت سے دور ہو جانا اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اے عیسیٰ میں تجھے مقتول اور مصلوب نہیں ہونے دوں گا بلکہ تو طبعی موت سے وفات پائے گا۔ اور یہ لوگ جو گمان کرتے ہیں کہ تجھے صلیب دے کر وہ سر اونچا کر کے کہیں گے کہ دیکھو مسیح اللہ کی رحمت سے دور تھا (ملعون، معاذ اللہ) اسی لئے اسے صلیب کی موت نصیب ہوئی، انہیں بتا دوں گا کہ تو میری رحمت سے دور نہیں بلکہ میرا مقرب ہے (وَرَافِعُكَ اِلَیَّ۔)

ہر وہ شخص جس کا ذہن سلیم ان تمام روایات سے خالی ہو جنہیں بدقسمتی سے قرآن حکیم پر حَکَم تسلیم کر لیا گیا اور وہ رب ذو الجلال کی اس سنت مقدسہ سے بھی واقف ہو جو انبیاء کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے وقت ظہور میں آتی ہے ان آیات کو پڑھتے وقت ان کا وہی مفہوم اخذ کرے گا جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

یہ عجیب نکتہ میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ مسیح کو یہود کے درمیان سے آسمان پر لے جانے کو "مکر" (خفیہ تدبیر) کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے اور پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ "مکر" یہودیوں کے "مکر" سے بہتر تھا۔ حالانکہ وہ اس چیز کا سرے سے مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انسانی "مکر" کے مقابلہ میں اللہ کی خفیہ تدبیر پر "مکر" کے لفظ کا اطلاق اسی وقت جائز ہے جب وہ تدبیر عام عادت سے خارج نہ ہو اور انسانی "مکر" کے اسلوب پر نافذ ہو سکے جس طرح آنحضرت صلعم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ۝

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

عیسیٰؑ کے آسمان پر جانے کا منکر کافر قرار نہیں دیا جا سکتا

(ا) قرآن و حدیث میں ایسی کوئی سند موجود نہیں جس کی بنا پر یہ عقیدہ قائم کیا جا سکے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے اب تک وہاں زندہ ہیں اور وہاں سے آخری زمانہ میں اتریں گے۔

(ب) قرآن حکیم کی تصریحات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ محض یہی ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰؑ سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ انہیں عمر طبعی کے اختتام پر وفات دے گا۔ ان کے درجات بلند فرمائے گا اور انہیں کافروں کے بُرے عزائم سے محفوظ رکھے گا اور یہ وعدہ پورا ہو گیا ہے حضرت مسیحؑ کے دشمن نہ انہیں قتل کر سکے ہیں نہ مصلوب۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدت پوری کر کے انہیں وفات دی اور اپنا قرب عطا فرمایا۔

(ج) جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کے جسم سمیت آسمانوں پر اٹھائے جانے، وہاں زندہ ہونے اور آخری زمانے میں نزول فرمانے سے انکار کرتا ہے وہ کسی قطعی اور یقینی چیز سے انکار نہیں کرتا۔ لہٰذا اسے اسلام اور ایمان سے خارج قرار دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے اس پر ارتداد کا حکم لگانا کسی طرح درست نہیں بلکہ وہ مومن و مسلم ہے جب وہ فوت ہو تو مسلمانوں کی طرح اس کا جنازہ پڑھنا چاہیئے اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا چاہیئے۔ اللہ کے نزدیک تو اس کے ایمان میں کوئی شبہ نہیں۔ وَاللّٰہُ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرٌ بَصِیْرٌ۔

طلوع اسلام

یہاں اتنے اضافہ کی ضرورت ہے کہ جب قرآن کریم کی رُو سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ وفات پا گئے تو پھر ان کے دوبارہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اصلی مسیحؑ کا، نہ ان کے کسی مثیل کا۔ اس کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں۔

راولپنڈی کے احباب نوٹ فرمالیں کہ

ہر جمعہ کی شام کو ۷ بجے بمقام الکوثر بلڈنگ۔ بالمقابل گورنمنٹ گرلز کالج۔ مری روڈ۔ پرویز صاحب کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔

شیخ محمد عبدہٗ کی اصلاحی تحریک

(محترم محمود الحق صاحب ریسرچ اسسٹنٹ ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

(انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلامی کی جن ممتاز ہستیوں نے ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مسلسل کوشش کی، ان میں ایک طرف سرسیدؒ اور دوسری طرف سید جمال الدین افغانیؒ اور ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہٗ کے اسمائے گرامی سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ مفتی عبدہٗ کا تعارف ہمارے ہاں کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ ہم اس ضمن میں ایک سلسلۂ مضامین شائع کرنا چاہتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے مجلہ اسلامیہ کی اشاعت بابت جون ۱۹۶۲ء میں ذیل کا مقالہ ہماری نظر سے گزرا جسے ہم مجلہ مذکور کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس مقالہ کی اشاعت سے ہمارا مقصد مفتی عبدہٗ کا عمومی تعارف ہے۔ ان کی مساعی کا تنقیدی جائزہ نہیں۔ نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ہم مفتی مرحوم کے تمام خیالات سے متفق ہوں یا صاحب مقالہ کے خیالات سے۔ طلوع اسلام)۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب دنیائے اسلام پر مغرب کا اثر و اقتدار بڑھا تو مسلم معاشرہ شدید بحران میں مبتلا ہو گیا۔ ایشیا کا وہ سماجی ڈھانچہ جو ازمنۂ وسطیٰ سے قائم تھا نشوء ارتقاء کی ساری صلاحیتیں کھو چکا تھا اور یاس و مجہولیت کے سوا زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی مغرب کا طاقتور صنعتی سماج جدید سائنس اور ٹیکنولوجی سے لیس تھا اور اس کی بنیاد نئی پیداواری قوتوں پر تھی۔ چنانچہ جب ان تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوا تو مسلم معاشرے کے کھوکھلے پن کا بے نقاب ہونا ناگزیر تھا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بالکل نیا اور سابقہ تمام تجربوں سے مختلف تھا۔ اب زندگی کا کوئی پہلو مغربی اثرات کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جہاں تک مذہبی زندگی کا تعلق ہے، مغربی علوم اور سائنس کی پیش قدمی نے

مسلمانوں (خصوصاً جدید تعلیم یافتہ نوجوان طبقے) کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا کر دئے اور ان کے مذہبی معتقدات متزلزل ہونے لگے۔ اب پیچ در پیچ مقدمات، منطقی اصطلاحات اور فقہی توجیہات کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ سیاسی طور پر مسلم ممالک اپنے پڑوسی ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح عام طور پر مغربی استعمار کی جارحانہ سیاست کے شکار ہو گئے اور ان کی آزادی، محکومی یا نیم محکومی میں منتقل ہو گئی۔

یہ تھا جدید اصلاحی تحریکات کا عام پس منظر، بہرحال اصلاح و تجدید کے تقاضے جس قدر شدید تھے علمائے اسلام نے انہیں اسی شدت سے نظر انداز کر دیا اور ازمنۂ وسطیٰ کی ان روایات ہی کی ترجمانی کرتے رہے جنہیں انہوں نے تقدس کا درجہ دے دیا تھا۔ ان قدامت پسندوں کا عقیدہ تھا کہ اسلاف سے جو کچھ ترکہ حاصل ہوا ہے وہ مقدس اور ناقابلِ تغیر ہے۔ اس میں کسی قسم کی ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے "تحفظ دین" کے نام پر روشن خیالی اور فکری آزادی کی ہر کوشش کو ہدفِ ملامت بنایا۔ یہی وہ حالات تھے جب دنیائے اسلام کے متعدد گوشوں سے مسلم مصلحین نے آواز بلند کی اور مسلمانوں کو یاس و نا امیدی کی فضا سے نکالنے اور زندگی کی بدلی ہوئی قدروں کے مطابق نئے تقاضوں سے روشناس کرنے کے لئے اصلاحی تحریکوں کا آغاز کیا۔ ان اصلاحی تحریکوں میں شیخ محمد عبدہؒ کی تحریک کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے جدید اسلام کو انسان دوستی (HUMANISM) کی روایات سے متعارف کرنے کی جدید کوشش کی۔

محمد عبدہؒ کی تعلیمات کا تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مشفق استاد اور مربی سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ - ۱۸۹۸ء) کا مختصر تعارف کرایا جائے جنہیں نہ صرف شیخ محمد عبدہؒ کے اندر اصلاح و تجدید کا جذبہ پیدا کرنے میں بہت زیادہ دخل تھا[1] بلکہ جو مصر اور دنیائے اسلام میں قومی بیداری اور اصلاحی تحریکات کے سب سے بڑے محرک مانے جاتے ہیں۔ جمال الدین افغانی مسلم معاشرے کی مردہ رگوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑانا چاہتے تھے اور اسی مقصد کے حصول میں انہوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ جمال الدین افغانی کا خیال تھا کہ مسلم ممالک ایک دفعہ مغربی تسلط اور ان کے دست برد سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور اسلام میں ایسی

---

[1] محمد عبدہؒ اپنے استاد کی عنایات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں " إن أبي وهبني حياة يشاركني فيها علي و محروس (هما اخوان له كانا مزارعين) والسيد جمال الدين وهبني حياة أشارك فيها محمداً و ابراهيم وموسى و عيسى والاولياء والقديسين " احمد امين : زعماء الاصلاح في العصر الحديث، (مصر ۱۹۴۸ء) ۲۹۲۔ باپ نے مجھے ایسی زندگی عطا کی جس میں علی اور محروس (مفتی صاحب کے بھائیوں کے نام ہیں، جو کاشتکار تھے) میرے شریک تھے لیکن سید جمال الدین افغانی نے مجھے وہ زندگی عطا کی ہے جس میں محمدؐ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور اولیاء و مقدسینؒ میرے رفیق ہیں۔

اصلاحات نافذ کر دی جائیں جن سے زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کی تکمیل کی جا سکے تو مسلمان بھی مغربی اقوام کی طرح ایک جدید اور شاندار نظام زندگی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ غرضیکہ جمال الدین مسلمانوں کی سیاسی بیداری کو مقدم سمجھتے تھے اور اپنے مقاصد کو سیاسی انقلاب کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ ان کی تمام تر مساعی سیاسی تھیں لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ان کی تحریک میں اصلاحی پہلو کا فقدان تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمال الدین ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے جس بیداری کا آغاز کیا اس کا اثر تقریباً زندگی کے ہر پہلو میں محسوس کیا گیا۔ ان کے بے شمار مصری شاگردوں میں سے کچھ نے تو ان کے سیاسی مسلک کو اپنایا جن میں احمد ندیم اور ادیب اسحٰق کے نام خاص طور پر مشہور رہیں لیکن ان کی تعلیمات کے اخلاقی پہلو کو ان کے لائق ترین شاگرد شیخ محمد عبدہؒ نے پروان چڑھایا اور مصر میں جدید اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ خود محمد عبدہؒ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں سید جمال الدین افغانی کے سیاسی مسلک پر چلتے رہے اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۸۲ء کی "عرابی بغاوت" میں انہوں نے ایک سچے محب وطن اور مجاہد کی طرح حصہ لیا اور وہ جلا وطن کئے گئے۔ بالآخر خصوصاً یورپ سے واپسی کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تدریجی اصلاح اور تعلیم ہی کے ذریعہ مسلمانوں کی حالت سدھاری جا سکتی ہے جو انجام کار سیاسی آزادی پر منتج ہوگی۔ اس طرح شیخ محمد عبدہؒ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور اصلاحی کاموں میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے سر سید احمد خانؒ کی طرح انہوں نے بھی انگریزوں کا تعاون[۲] حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ یہاں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ

---

[۱] رشید رضا: تاریخ الاستاذ الامام (مصر، ۱۹۳۱) ۱: ۲۱۔

[۲] اس سلسلے میں محمد عبدہؒ کا یہ فتویٰ مشہور ہے: قد قامت الادلة من الكتاب والسنة وعمل السلف على جواز الاستعانة بغير المؤمنين وبغير الصالحين على ما فيه خير ومنفعة للمسلمين وان الذين يعدون الى هذه الاستعانة يجمع كلمة المسلمين وتربية ابنائهم وما فيه خير لهم لم يفعلوا الا ما اقتضته الاسوة الحسنة بالنبى واصحابه، وان من كفرهم او فسقهم فهو بين الامرين: اما كافر او فاسق، فعلى دعاة الخير ان يجعلوا فى دعوتهم ان يمضوا على طريقتهم، ولا يحزنهم شتم الشاتمين، ولا يغيظهم لوم اللائمين، فان الله كفيل لهم بالنصر اذا اعتصموا بالحق والصبر۔ رشید رضا: تاریخ ۱: ۶۶۶۔

کتاب و سنت اور تعامل سلف سے قوی دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی کے کاموں میں کفار اور فساق سے تعاون طلب کرنا جائز ہے۔ اور جو لوگ ترجمیت، تعلیمی وغیرہ کے سے اصلاحی و رفاہی کاموں میں کفار و فساق سے مدد طلب کرتے ہیں وہ سنت نبوی اور اسوۂ صحابہؓ کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ جو لوگ ایسا کرنے والوں کی تکفیر یا تفسیق کرتے ہیں وہ خود یا تو کافر ہیں یا فاسق۔ بس داعیان خیر و اصلاح کو چاہیے کہ ذمّان دریدہ دہنوں کی لعنت ملامت کی پرواہ نہ کریں اور جادہ حق و صداقت پر صبر و ثبات کے ساتھ چلتے رہیں۔ اگر انہوں نے صبر و استقلال سے کام لیا تو اللہ کا تعاون ان کے شامل حال رہے گا۔

شیخ محمد عبدہٗ اپنے ملک کے سیاسی تقاضوں سے بہت حد تک بے خبر ہو گئے اور قومی آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کی بجائے کسی حد تک برطانیہ کی استعماری سیاست کے شکار ہو گئے اور انگریزی حکومت کی رواداری، آزادی اور شائستگی کے گُن گانے لگے اور اس کے تاریک پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ بہرحال اس سیاسی غلطی کے باوجود شیخ محمد عبدہٗ نے زندگی کے دوسرے میدان میں جو اہم کارنامے انجام دئے ہیں وہ ان کی عظمت کے ضامن ہیں۔

ہندوستان میں سرسید احمد خاں اور مصر میں شیخ محمد عبدہٗ کی تعلیمات کے زیر اثر جو اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں ان سب کا محرک ایک ہی تھا۔ یعنی مسلمانوں کے اندر سے صدیوں کے جمود و تعطل کو ختم کرنا اور انہیں جدید مغربی تہذیب کی برکتوں سے فیض حاصل کرنے کے لئے آمادہ کرنا اور اس مقصد کے حصول کے لئے مذہب کی تعبیر میں ضروری اصلاح و ترمیم کرنا تاکہ اسلام خود بھی زندہ ہو جائے اور پست حال مسلمانوں کو زندہ کرنے کا باعث بھی بن سکے۔

باوجود اس کے کہ ان دونوں مکاتب فکر کا تاریخی مشن ایک تھا۔ پھر بھی ان کا زاویۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سرسید احمد خاں نے اسلام کو مغرب کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور محمد عبدہٗ نے مغرب کو اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ سرسید کی تعلیمات میں معذرت خواہانہ انداز کا غلبہ زیادہ ہے۔ وہ اسلام کو عصر حاضر کی مغربی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی ہر ممکن یا ناممکن کوشش کو روا رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس شیخ محمد عبدہٗ ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ وہ سلف کے مسلک پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا اصلاحی مقصد (جو درحقیقت ان کی تحریک کی امتیازی خصوصیت ہے) نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ ان دو مکاتب اصلاح کے پس منظر کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک ڈچ مصنف (BALJON) نے لکھا ہے کہ محمد عبدہٗ ایک ایسے مذہبی ماحول کے پروردہ تھے جہاں الہیاتی علوم سے گہری واقفیت ایک عالم کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف سرسید احمد خاں شرفا کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مغل دربار سے وابستہ تھا۔ جہاں ایرانی تہذیب کا گہرا اثر تھا اور جسے عام پسندیدگی حاصل تھی۔[۴]

سرسید کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمان جب تک زندگی کے رہن سہن، طور طریقے اور کھانے پینے میں حکمران طبقے کے رنگ میں نہ رنگ جائیں گے اس وقت تک ان کا احساس کمتری دور نہ ہوگا اور نہ انگریز انہیں عزت کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس کے برعکس شیخ محمد عبدہٗ کا خیال تھا کہ پوری قوم کو معاشرتی پستی سے نکالنے اور تہذیب و تمدن کی بلند سطح پر اٹھانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مغربی تہذیب کا سطحی علم حاصل کر لیا جائے اور ان کی اندھی نقالی کی جائے۔[۵] مشہور برطانوی فلسفی ہربرٹ اسپنسر

---

۴ J.M.S. BALJON, MUSLIM MODERN QURAN'S INTERPERTATION (LEIDEN, 1961) P. 4.

۵ رشید رضا: تاریخ ۲: ۱۲۲، ۱۲۳ وغیرہ۔

(HERBERT SPENCER) سے محمد عبدہؒ کی جو گفتگو ہوئی تھی[۶] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مغرب کی بڑھتی ہوئی "مادیت" سے کس قدر شاکی تھے۔ لیکن چونکہ ان کے اندر سائنٹفک نقطۂ نظر کی کمی تھی اس لئے انہوں نے مذہبی روح کے فقدان کو اس کا اصل سبب قرار دیا اور اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہے کہ یورپ کی یہ مادی ہوس دراصل اس سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی نتیجہ تھی جو یورپ میں رائج تھا۔ بایں ہمہ محمد عبدہؒ کو اس امر کا احساس ضرور تھا کہ مغربی معاشرہ سرمایہ داروں اور مزدوروں پر مشتمل دو متخاصم طبقوں میں منقسم ہے۔ جس کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں[۷]۔

محمد عبدہؒ نے اسلام کی تاویل اس زاویۂ نظر سے کی جو یورپ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے درمیان سیکولر علوم کے فروغ پانے کے سبب پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے اسلام کی تقریباً وہی تصویر پیش کی جو اس سے پہلے سرمایہ دارانہ یورپ میں مسیحیت نے اختیار کی تھی۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ مسیحیت نہیں بلکہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو تہذیب حاضرہ کی روح کے عین مطابق ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کے "عالمگیر" مذہب ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں ایسی صلاحیت موجود ہے کہ یہ ہر زمانہ اور ہر ثقافتی دور سے مطابقت پیدا کر سکتا ہے۔ شیخ محمد عبدہؒ نے مسیحی مصنفوں کے اس دعوے کی شدت سے تردید کی کہ یورپ کی جدید (لادینی) تہذیب نصرانیت کی رہین منت ہے۔ اس لئے کہ نصرانیت نے سائنس کی جانب جو معاندانہ رویہ اختیار کیا اسی کے باعث یورپ میں سائنس کو فروغ حاصل ہوا اور اس کے نتیجے میں تہذیب حاضرہ وجود میں آئی[۸]۔ محمد عبدہؒ کا کہنا ہے کہ سولہویں صدی میں یورپ میں جو سائنسی اور صنعتی ترقی ہوئی وہ درحقیقت اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ تھی[۹]۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ سوائے مسئلۂ انکار نبوت کے اسپرٹ کے لحاظ سے پروٹسٹنٹ (PROTESTANTS) اوائل اسلام کے مسلمانوں سے مشابہ ہیں[۱۰]۔ شیخ عبدالمجید سلیم (سابق شیخ الازہر اور شیخ محمد عبدہؒ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ یورپ سے لوٹنے کے بعد محمد عبدہؒ نے ان سے کہا: "میں یورپ گیا اور دیکھا کہ لوگ نام سے مسلمان نہیں ہیں لیکن عمل سے مسلمان ہیں۔ میں واپس آیا اور دیکھا کہ لوگ نام سے مسلمان ہیں لیکن عمل سے مسلمان نہیں[۱۱]"

۶؎ W.S. BLUNT, MY DIARIES (LONDON, 1932) P. 481.

۷؎ عثمان امین: "رائد الفکر المصری" (مصر، ۱۹۵۵) ص ۲۴۹۔

۸؎ دیکھئے خاص طور پر محمد عبدہ کی کتاب: الاسلام والنصرانیۃ مع العلم والمدنیۃ۔

۹؎ رسالۃ التوحید: مقدمہ۔ محمد عبدہؒ ایک جگہ لکھتے ہیں: الاتری ان نظامھم ... یقرب من نظام المسلمین

۱۰؎ رسالۃ التوحید؛

"الاسلام والنصرانیۃ" ص ۱۵۰۔ ان کے نظام کو دیکھو وہ مسلمانوں کے نظام کے کس قدر قریب ہے۔

۱۱؎ "لقد ذھبت الیھا فوجدت مسلمین عملاً لا قولاً، وعدت فوجدت مسلمین قولاً لا عملاً"۔ یوسف موسیٰ الحسینی: الاخوان المسلمون (بیروت ۱۹۵۵) ص ۱۲۹۔

درحقیقت جدید اصلاحی تحریک یورپ کی لبرل تحریک کی دین ہے۔ مسلم مصلحین کی عموماً تمام تر توجہ اس جانب تھی کہ اسلام کو ان "لبرل خیالات"[۱۰] کی روشنی میں پیش کیا جائے جو انیسویں صدی میں یورپ میں پیدا ہوئے تھے۔ غرضیکہ جس طرح پہلے یہ قدریں مسیحیت کا لازمی جزو بن گئی تھیں اب اسلام کا لازمی جزو بن گئیں۔ حالانکہ جیسا پروفیسر کینٹول اسمتھ (CANTWELL SMITH) نے واضح کیا ہے جاگیری عہد میں یہ قدریں ان دونوں مذاہب میں سے کسی کا جزو لاینفک نہ تھیں نہ تو ازمنۂ وسطیٰ میں مسیحیت کا اور نہ اٹھارہویں صدی میں اسلام کا تھا[۱۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد عبدہؒ کی تعلیمات میں احیائی میلانات بھی پائے جاتے ہیں[۱۲] اور وہ غالباً اسلام کی بھی باتیں کرتے ہیں نکلے[۱۳] لیکن یہ ان کی تعلیمات کا محض ایک پہلو ہے۔ شیخ محمد عبدہؒ کی ساری تعلیمات اور ان کی زندگی بھر کے کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد جو چیز نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ ان کا اصلاحی اور اخلاقی پہلو ہے۔ اگرچہ وہ مذہب کی اصلاح کرنا چاہتے تھے تاکہ اسے قبول عام کی سند حاصل ہو جائے اور اسلام کے ابتدائی دور کی عظمت کو بحال کیا جا سکے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عقل کی حاکمیت پر بہت زور دیا اور روشن خیالی کی تلقین کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی کٹرپن اور احیائی رجحان کمزور ہوا۔ مغربی علوم، سائنس اور لبرل خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے زمین ہموار ہوئی۔ محمد عبدہؒ کی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسے اسی زاویۂ نظر سے دیکھیں۔ اس وقت یہ ممکن ہو سکے گا کہ ان کی اصلاح پسندی پر مذہبیت کا جو پردہ پڑا ہوا ہے اسے علیحدہ کر کے تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کیا جائے۔

---

۱۱ (MODERN ISLAM IN INDIA, (LAHORE, 1947) P. 45

۱۲ حقیقت یہ ہے مسلم مصلحین ایک ہی سانس میں دونوں باتیں کہتے تھے: ایک طرف تو وہ یہ کہتے تھے کہ اسلام جدید خیالات کا منکر نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اسلام میں یہ باتیں پہلے سے بدرجہ اتم موجود ہیں۔

۱۳ مثلاً آیت قرآنی ۲۴: ۵۵: "وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم، ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضی لهم، ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہؒ نے کہا کہ ان اللہ تعالیٰ لما ینجز لنا وعده هذا کله بل بعضه ولابد من اتمامه بسیادة الاسلام فی العالم کله حتی ادیانه المعادیة له۔ رشید رضا: تفسیر المنار ۱: ۲۴۔

"خدائے قدوس نے غلبۂ اسلام کا مذکورہ وعدہ بہ تمام و کمال پورا نہیں کیا۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ وقت آنے والا ہے جب دین اسلام عالم انسانیت پر چھا جائے گا یہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوگی جس میں مشرق و مغرب پر اس کا غلبہ ہوگا۔"

اگرچہ محمد عبدہؒ کے نزدیک مسلمانوں کو پستی سے باہر نکالنے کا واحد علاج یہ تھا کہ مسلمان قرونِ اولیٰ کے اسلام کی طرف لوٹ جائیں جسے وہ حقیقی اسلام کہتے تھے مگر اس میں تنگ نظری اور کٹر پسندی کو دخل نہیں تھا۔ ان کا حقیقی اسلام نہ صرف جدید تقاضوں کا منافی نہیں ہے بلکہ اس سے ہم آہنگ ہے۔ جیسا کہ (C. ADAMS) کا خیال ہے، محمد عبدہؒ ایک طرف دین کی اصلاح کرنا چاہتے تھے تو دوسری طرف وہ چاہتے تھے کہ عوام کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس خالص دین کو خلوصِ قلب اور پُرجوش طریقے پر مانیں اور عمل کریں[۵۵]۔ درحقیقت وہ اسلام میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے تاکہ اس کی طاقت سے مسلم عوام کو پسماندگی اور زبوں حالی کی سطح سے اوپر اٹھایا جائے۔ شیخ محمد عبدہؒ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے ساتھ جو وابستگی اور عقیدت ہے اسے اصلاحی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ مذہب ان کے خیال میں مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ ادب و حکمت کے ذریعہ یہ کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے عملی صورت یہی ہے کہ مذہبی بنیادوں پر اصلاح کی عمارت تعمیر کی جائے[۵۶]۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیخ محمد عبدہؒ کا مشن مذہبی تھا۔ اور یہ کہ ان کی تحریک کی عمومی نوعیت دینی اصلاح کی تھی۔ یہ بات ایک مخصوص حد تک تو صحیح ہے لیکن اگر ہم ان کی تمام تعلیمات اور ان کی زندگی بھر کی گوناگوں مصروفیات پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی اس تحریک کی نوعیت بنیادی طور پر اصلاحی تھی۔ انہیں اپنی زندگی میں جو بھی مواقع ملے ان کو انہوں نے اصلاحِ معاشرہ کے حصول کا ذریعہ بنا لیا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی جب کہ وہ جامع ازہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اصلاحِ معاشرہ کا خیال ان کے دل میں جاگزیں تھا۔ اور وہ اپنے ہم وطنوں کی زبوں حالی پر دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ مسلم معاشرے پر جمود و تعطل کا جو گہرا اثر تھا اس سے ناامید ہو کر وہ ایک دفعہ تصوف کی پناہ گاہ میں پہنچ گئے مگر ان کے چچا شیخ درویشؒ نے انہیں روحانیت کی بھول بھلیوں سے نکالا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا شیخ محمد عبدہؒ کو زندگی کے مرکزی مسائل کی جانب متوجہ کرنے میں سید جمال الدین افغانی کو بہت زیادہ دخل تھا انھوں نے ہی شیخ محمد عبدہؒ اور اپنے دوسرے شاگردوں کو پریس کی اہمیت جتائی اور انہیں صحافت کی طرف متوجہ کیا چنانچہ جمال الدین کی تعلیمات کے زیرِ اثر شیخ محمد عبدہؒ نے مصر کے اخباروں میں مضامین لکھے اور اپنے معاشرے کی حیلہ بازیوں پر تنقید کی اور ان کے لئے علاج تجویز کیا۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے اپنے ایک مضمون میں مصر کے اعیان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

---

[۵۵] C. ADAMS ISLAM AND MODERNISM IN EGYPT (OXFORD, 1933) P. 109.

[۵۶] رشید رضا: تاریخ ۲، ۵۷، ۴ – ۲۹۰

[۵۷] رشید رضا: تاریخ ۱: ۱۰۷ اس وقت محمد عبدہؒ کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ اور وہ ازہر میں تعلیم پا رہے تھے۔ محمد عبدہؒ کے اندر یہ کیفیت پیدا کرنے میں خود ازہر کے طریقۂ تعلیم کو بہت زیادہ دخل تھا جو ہر لحاظ سے ناقص تھا۔

[۵۸] ایضاً: ۲۳۔

اگر ہم اپنی ہلاکت سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ہمسایہ ملکوں کی حالت پر نظر ڈالنی چاہیے۔ اس وقت یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ مغربی اقوام کی ترقی اور غلبہ کا راز یہ ہے کہ انہوں نے علوم جدیدہ کو اپنا لیا ہے۔ اب ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم پورے شد و مد سے ان مفید علوم کی اپنے ملک میں ترویج و اشاعت کریں۔ بس یہی ایک واحد طریقہ ہے جس پر چل کر ہم اپنے مافات کی تلافی کر سکتے ہیں اور آنے والی برکات کے لئے مستعد ہو سکتے ہیں[19]

شیخ محمد عبدہؒ جب مصر کے سرکاری اخبار "الوقائع المصریہ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو ایک طرح سے ان کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی۔ اب انہیں ایک ایسا آرگن ہاتھ آگیا جس کے ذریعہ وہ اپنے اصلاحی خیالات کو ملک بھر میں پھیلا سکتے تھے بلکہ اثر و اقتدار کے لحاظ سے انہیں مصر کی پبلک زندگی میں ایک اہم درجہ حاصل ہو گیا۔ انہیں یہ آزادی حاصل ہو گئی کہ وہ فاسد افروں اور بدنیت عہدیداروں کے کردار سے لوگوں کو واقف کریں۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ یہ اخبار اصلاح معاشرے کا موثر ترین حربہ بن جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ایک سچے مصلح اور معلم اخلاق کی حیثیت سے محمد عبدہؒ نے اپنے معاشرے کے جملہ نقائص اور بے ہودہ رسم و رواج پر کڑی تنقید کی۔ اور انہیں بے نقاب کیا[20]۔ جیسا کہ ایک مصری مصنف عثمان امین نے لکھا ہے کہ شیخ محمد عبدہؒ بتدریج تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنی قوم کا معیار بلند کرنا چاہتے تھے اور اس میں اجتماعی بیداری کی روح پھونکنا چاہتے تھے[21] اس طرح جب وہ جمال الدین افغانی کی معیت میں پیرس سے "العروۃ الوثقیٰ" نکال رہے تھے اور جمال الدین کے "پان اسلازم" کے زیر اثر تھے اس وقت بھی محمد عبدہؒ کا اصلاحی پہلو اوجھل نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں "نہ تو افسوس سے مردہ زندہ ہو سکتا ہے، نہ افسوس مافات کی تلافی کر سکتا ہے اور نہ غم و حزن مصیبت کو ٹال سکتا ہے۔ عمل ہی فلاح و بہبود کی کنجی ہے صدق[22] و اخلاص ترقی کا زینہ ہے۔ خوف موت کو قریب کر دیتا ہے۔ یاس اور کم ہمتی ہلاکت کے اسباب ہیں[23]۔ انہوں نے کہا کہ ناامیدی کافر دل کا خاصہ ہے"

اس سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جب شیخ محمد عبدہؒ مصر کے مفتی اعظم[24] کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے مختلف موقعوں پر بے شمار فتوے صادر کئے جن میں اصلاحی و اخلاقی جذبہ کام کر رہا ہے۔ درحقیقت انہوں نے اپنی سرگرم و متنوع زندگی میں جتنے بھی عہدے قبول کئے ان میں ان کے اصلاحی مقصد کے پیش نظر مفتی اعظم کا عہدہ خصوصی اہمیت رکھتا ہے[25]

---

[19] رشید رضا: تاریخ ۲: ۳۴ - ۳۵

[20] الیضا ۱: ۱۲۶، ۱۷۵ — ۱۸۰

[21] عثمان امین: رائد الفکر ۲۹

[22] رشید رضا: تاریخ ۲: ۱۸۰

[23] الیضا ۲: "مضمون الامل"

[24] وہ اس عہدے پر ۳ جون ۱۸۹۹ء سے تا دم مرگ (۱۹۰۵ء) فائز رہے۔

[25] چارلس آدمز (CHARLES ADAMS)

شیخ محمد عبدہؒ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح تھی کہ ان کی زندگی کا واحد مقصد اصلاح اخلاق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجرد بحثوں میں پڑنے سے گریز کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ان مسائل سے بحث کرتے تھے جن کا تعلق لوگوں کے اعمال و افکار سے تھا۔ وہ علماء کے اس بے تکی پن کو ان کی علمی سرگرمیوں کا تعلق لوگوں کی زندگیوں سے بالکل نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بات بار بار کہی کہ وہ مباحث جن پر علمائے ازہر کی ساری زندگیاں وقف ہیں اگر ان سے عوام کو اپنی حالت کے بہتر بنانے میں مدد نہیں ملتی تو ایسے علمی مشاغل کی قیمت ایک ٹکے کے برابر بھی نہیں ہے[26]۔ انہوں نے کہا کہ علم کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو عمل کی جانب راغب کرتا ہے اگر "علم" سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ علم نہیں کوئی اور شے ہے[27]۔ یہی وجہ ہے کہ جب شیخ محمد عبدہؒ جامع ازہر کے رواق عباسی میں شہر کے اعیان کے سامنے قرآنی آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو وہ ہمیں مفسر قرآن سے زیادہ معلم اخلاق نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی شخص ان کی تفسیروں کے پڑھنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ وہ متعدد الجھے ہوئے مسائل اور نزاعی بحثوں سے دامن بچاتے ہوئے، الگ الگ آیات میں ربط قائم کرتے ہوئے اپنے مقصد کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان آیات پر توقف کرتے ہیں جہاں سے انہیں اپنے معاشرے کی کسی برائی پر حملہ کرنے کے لئے کچھ مواد فراہم ہوتا ہے یا جن آیات کا تعلق لوگوں کی اخلاقی زندگی سے ہے۔ اس سلسلے میں ان آیات کو بھی جو "کافروں" کے متعلق ہیں مسلمانوں کے حال پر چسپاں کرتے ہیں جنہیں قرآن کی نظر میں معتوب گردانتے ہیں[28]۔ ان کی تفسیر پر بحث کرتے ہوئے عثمان امین نے صحیح کہا ہے کہ محمد عبدہؒ کی تفسیر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلم معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں ایک فعال وسیلہ ہے، روح اخلاق سے بھرپور ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زمانے کے مذاق اور اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے[29]۔ خود شیخ محمد عبدہؒ نے اپنی تفسیر کا مقصد اس مختصر فقرے میں ادا کر دیا ہے۔ قرآن کو اس طرح سمجھنا کہ یہ بحیثیت دین کے ہے جو لوگوں کو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے[30]۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے دوسروں کے اقوال اور ان کے فہم کے بارے میں نہیں پوچھے گا بلکہ وہ ہم سے اپنی اس

---

[26] رشید رضا: تاریخ ۲: ۲؛ ۹ – ۵: ۹؛ رشید رضا: تفسیر المنار ۱: ۵۲ – ۱۵۳

[27] "لاشیٔ من العلم ایعد صحیحاً الا العلم الذی یھدی الی العمل، وھو ذلک العلم المتمکن فی النفس الذی تصدر عنہ الآثار مطابقۃ لہ"۔ رشید رضا: تاریخ: ۲۱۲ "وہ علم علم ہی نہیں جو عمل پر آمادہ نہیں کرتا۔ اصل علم وہ ہے کہ جب قلب و دماغ میں گھر کر جائے تو اس کے مطابق اعمال ظہور میں آئیں"۔

[28] احمد امین: زعماء ۳۲۹۔

[29] عثمان امین: رائد الفکر ۱۶۶۔

[30] "فھم الکتاب من حیث ھو دین یرشد الناس الی ما فیہ سعادتھم فی حیاتھم الدنیا وحیاتھم الآخرۃ" تفسیر المنار ۱: مقدمہ۔

کتاب کے بارے میں پوچھے گا جو اس نے ہمارے رشد و ہدایت کے لئے بھیجی ہے[۴۱]۔ شیخ محمد عبدہ کی تفسیر کے سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ بھی سرسید احمد خاں کی طرح قرآن کی مدافعت کے خیال سے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ صرف اسی بات کے کہنے پر اکتفا نہیں کرتے کہ قرآن میں غیر سائنسی نظریات کا وجود نہیں ہے بلکہ ان کا اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ وہ یورپ کے سائنسی ایجادات کو خود قرآن کے اندر سے ثابت کرتے ہیں۔ ان کی تفسیر کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ وہ قرآن کی مدافعت کی غرض سے ان آیتوں کی جو عالم ارواح سے متعلق ہیں مثلاً دوزخ، جنت، لوح و قلم اور میزان وغیرہ اور جنہیں قرآن جسمانی اور حسی سمجھتا ہے نفسیاتی تاویلات کرتے ہیں اور ان کی ماورائیت کو کم کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں[۴۲]۔ بہرحال یہ محمد عبدہ کی تفسیر کا غالب رجحان نہیں جیسا کہ احمد امین نے واضح کیا ہے۔ ان کی تفسیر کی اصل قدر و قیمت یہ ہے کہ یہ قرآن میں علمی مسائل کا حل ڈھونڈھنے کی بجائے کہیں زیادہ لوگوں کے جذبات کو ابھارتی ہے اور ان کے شعور کو بیدار کرتی ہے[۴۳]۔

وہ مسائل جن کا تعلق الٰہیات سے ہے محمد عبدہ کے نزدیک محض اخلاقی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں عقیدہ جبر و اختیار کا مسئلہ اسلام کی تاریخ کا ایک الجھا ہوا باب ہے اور شدید اختلافات کا باعث رہا ہے۔ ان اختلافات نے مسلمانوں کو دو فرقوں میں منقسم کر دیا۔ جو "جبریہ" اور "قدریہ" کہلائے۔ شیخ محمد عبدہ کو اس مسئلے سے اسی حد تک دلچسپی تھی جہاں تک کہ اس کا تعلق لوگوں کے اخلاق سے ہے انہوں نے اس اعتراض کی (جو عموماً مسیحیوں کی جانب سے کیا جاتا تھا) پرزور مذمت کی کہ اسلام کے عقیدہ "القضاء والقدر" سے تعطل عمل کا کوئی پہلو نکلتا ہے اور یہ کہ یہ عقیدہ مسلمانوں کے انحطاط کا باعث ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ قضا و قدر سے مراد

---

۴۱ رشید رضا: تفسیر المنار ۱، مقدمہ۔

۴۲ شیخ محمد عبدہ کے الفاظ ہیں: عالم الآخرة لیس فیہ نمو ابدان ولا تحلل مواد، علی نحو ما یکون للاحیاء فی ہذہ الحیاة الدنیا بل ذلک عالم خلود و بقاء، واللذائذ فیہا لذائذ سعادة والالام الام شقاء۔ فکل ما یقع فی ذلک العالم فانما بینہ و بین ما یقع فی عالمنا وجہ مشابہتہ لا وحدہ مجانسة ... ہل یلیق بمن خاف مقام ربہ ان یجبرؤ علی القول بوجوب الاعتقاد بان المیزان الذی یستعمل القبائل ...؟ تفسیر عم: ۱۴۶ — ۱۴۸۔

"عالم آخرت میں مادی اجسام کی نمو نہیں ہوگی۔ وہاں کی زندگی اس دنیا کی زندگی کی طرح نہیں ہوگی۔ وہ عالم عالم خلود و بقا ہے۔ وہاں کے لذائذ کامرانی و سعادت ہیں اور وہاں کے آلام شقاوت و حرماں نصیبی ہیں۔ دنیا اور عقبیٰ کے لذائذ و آلام میں مشابہت ہوگی مگر وحدت جنسی نہیں.... خدا سے ڈرنے والے کے لئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ میزان کا لفظ سن کر یہ اعتقاد لازم سمجھے کہ وہاں بھی یہی ترازو ہوگی جو یہاں مستعمل ہے..."

۴۳ احمد امین: زعماء ۲۳۰

مشیت الٰہی ہے جس کے مطابق انسان اپنے افعال کو ارادۂ خداوندی کی بجا آوری کا آلہ سمجھتا ہے۔ یہ خیال شیخ محمد عبدہ کے ہاں متعدد جگہ ملتا ہے کہ اگر عقیدۂ قضا و قدر کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ عقیدہ انسان کی انتہائی سعی و عمل کا متقضی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تاریخ میں جو زبردست ہستیاں گزری ہیں اور جنہوں نے دنیا میں انتہائی حیرت انگیز کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ سب اسی عقیدۂ قضا و قدر کے قائل تھے اور اسی عقیدے نے انہیں ناقابل تسخیر قوت اور توانائی عطا کی۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ عقیدۂ قضا و قدر انسان کی عملی سرگرمیوں کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس یہ عقیدہ ان سرگرمیوں کے لئے نفسیاتی طور پر ایک لازمی بنیاد تھا۔[۱۲۴] جہاں تک مسلمانوں کے اندر بے عملی کا تعلق ہے اس کی ذمہ دار بہت حد تک صوفیوں کی غلط تعلیمات ہیں جو صبر، اور توکل کے نام پر لوگوں میں یاس اور قنوطیت پیدا کرتی ہیں۔[۱۲۵]

جہاں تک اس مسئلہ کا الٰہیاتی پہلو ہے شیخ محمد عبدہؒ پرانے متکلمین کی لفظی موشگافیوں اور ان کی لاحاصل بحثوں سے واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے اس مسئلہ پر افراط و تفریط سے بچنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا کہ متقدمین نے اس مسئلہ پر طول طویل بحثیں کی ہیں لیکن ان تمام بحثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نقطۂ آغاز سے آگے نہ بڑھ سکے۔[۱۲۶] جہاں تک اس مسئلہ کا عملی پہلو ہے اس کی بابت انہوں نے کہا کہ ہر صحیح العقل انسان کو اس بات کا علم ہے کہ وہ اپنے افعال کو آزادی سے کر سکتا ہے اور ان کے انجام کو اپنی عقل سے سمجھ سکتا ہے۔ ایک قادرِ مطلق کے احساس کے باوجود انسان کو اپنے ارادہ آزاد کا شعور ہے۔[۱۲۷] وہ "رسالۃ الواردات" میں لکھتے ہیں کہ جس طرح عبد، فاعل ہے اسی طرح خدا، فاعل ہے اور جس طرح خدا فاعل ہے اسی طرح عبد فاعل ہے۔[۱۲۸]

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہؒ ایک اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مذہبی حدود میں رہتے ہوئے

---

۱۲۴ رشید رضا: تاریخ ۲: ۳۴۲۔

۱۲۵ اولئک الدراویش الخبثاء او المبلہ الذین یغشون اطراف الجزائر و تونس، ولا یخلو منہم الیوم قطر من اقطار الاسلام رشید رضا تاریخ: ۲ ۴۲۳ ان خبیث درویشوں اور خانقاہی احمقوں کی طرف اشارہ ہے جن سے تیونس اور الجزائر پٹے پڑے ہیں۔ بلکہ آج تو عالم اسلام کا کوئی گوشہ ان کے وجود سے خالی نہیں۔

۱۲۶ محمد عبدہؒ: التوحید ۶۱۔

۱۲۷ ایضاً ۵۹، ۶۲۔

۱۲۸ "فاللہ فاعل من حیث العبد فاعل، والعبد فاعل من حیث الرب فاعل، والوجود فی جمیع مراتبہ مختار" ۱۲۔ جس طرح عبد فاعل ہے اسی طرح خدا بھی فاعل ہے۔ اور جس طرح خدا فاعل ہے اسی طرح عبد بھی فاعل ہے۔ حق یہ ہے کہ وجود کسی حالت میں اختیار سے خالی نہیں۔"

عقیدہ جبر کا ایک گونہ اقرار ضروری ہے۔ اس سے کوئی مذہب مستثنیٰ نہیں ہے (قادرِ مطلق کے احساس کی موجودگی میں انسان کا ارادہ اختیار ہیچ نظر آتا ہے۔) چنانچہ ایک عیسائی مصنف ہانوتو (HANOTAUX) کے جواب میں انہوں نے کہا "یہ صحیح ہے کہ اسلام میں بعض باتیں ایسی ہیں جو انسان کو عقیدہ جبر کی طرف لے جاتی ہیں لیکن کون سا مذہب ایسا ہے جس میں یہ باتیں نہیں"[1]

عقیدہ جبر و اختیار کی طرح مسئلہ "حسن و قبح" بھی تاریخ اسلام کا ایک نازک مسئلہ ہے۔ شیخ محمد عبدہؒ نے اپنی مشہور تصنیف "رسالۃ التوحید" میں اس مسئلہ پر قدرے تفصیل سے بحث کی ہے لیکن جیسا کہ ان کی پوری تعلیمات کا غالب رجحان ہے یہاں بھی انہیں اس مسئلے سے اسی حد تک دلچسپی ہے جس حد تک کہ اس مسئلہ کا تعلق انسانی اخلاق سے ہے ان کے خیال میں ہر انسان کے اندر اشیاء کے خیر و شر کی تمیز کی صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ مثلاً "حسن" کا احساس مسرت اور حیرت کے جذبات پیدا کرتا ہے جب کہ "قبح" سے نفرت یا خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن جس طرح انسان محسوسات میں خیر و شر کی تمیز کر سکتا ہے اسی طرح معقولات میں بھی خیر و شر کی صلاحیت ادراک انسانی میں موجود ہے"[2]

[اس کے بعد مقالہ میں "خیر و شر" کے مسئلہ سے بحث کی گئی ہے لیکن وہ بحث محض متکلمانہ ہے اس لئے ہم نے اسے حذف کر دیا ہے ——————— طلوعِ اسلام۔]

مسلم معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں شیخ محمد عبدہؒ نے جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا وہ ہے عقلیت پسندی۔ دراصل یہ ان کی تحریک کا اساسی پہلو ہے۔ وہ کورانہ تقلید کو مسلمانوں کے جمود و تعطل کا بنیادی سبب سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تقلید اور روایت پسندی ایک بیمار معاشرے کی علامتیں ہیں جن سے شفایاب ہوئے بغیر ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل ناممکن ہے۔ وہ خود اپنے تجربہ سے جانتے تھے کہ روایت پسندی کس طرح لوگوں کے دل و دماغ کو جکڑ لیتی ہے اور نئے خیالات کے لئے ہمیشہ سدِ راہ ثابت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے روایت پسندی کے قلعہ کو مسمار کرنا شروع کر دیا اور آزادیٔ فکر کا علم بلند کیا۔[3] انہوں نے کہا کہ غور و فکر ہر ذی عقل انسان پر لازم ہیں۔ ان سے کسی کو مفر نہیں۔ اس ذی عقل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے ارد گرد جو دنیا ہے

---

[1] "نعم إن في الاسلام بعض نزعات تنحو الى تقييد الحرية و لكن اين الدين الذى خلا من تلك النزعات"؟ رشید رضا: تاریخ ۲: ۴۲۱ — بے شک اسلام میں بعض باتیں ایسی ہیں جو انسان کو عقیدہ جبر کی طرف لے جاتی ہیں مگر کون سا مذہب ایسی باتوں سے خالی ہے؟ (انسانی اختیار بے شک محدود ہے لیکن اپنے اعمال پر اسے اختیار حاصل ہے۔ (طلوعِ اسلام)۔

[2] التوحید ۹۵۔ [3] تاریخ ۲: ۱۱۳

اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کرے۔ موجودات و اشیاء کی تحقیق و تفتیش کرے اور اس سلسلے میں اسے جو خصوصی وسائل حاصل ہوں انہیں استعمال کر کے اپنے موقف کو یقینی براہین پر قائم کرے اور صحیح استدلال کام لے۔[۳۹] شیخ محمد عبدہؒ نے بتایا کہ مذہب ایک عام حاسہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ انسان اسباب فلاح کو تلاش کرے جن کو عقل صائب طور پر نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن آخری اختیار صرف عقل کو حاصل ہے۔[۴۰] ان کے نزدیک قرآن کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں بھی عقل کو کلی اختیار حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام کا دوسرا اصول ہے کہ جب کلامِ الٰہی کے لفظی معنی اور تقاضائے عقل کے درمیان اختلاف ہو تو عقل کے مطابق اس کی تاویل کرنی چاہیئے۔[۴۱] جہاں تک اسلاف کی آراء کا تعلق ہے اس کی بابت وہ لکھتے ہیں کہ حرف آخر ہونے کا حق نہ تو فرسودہ نصوص کو حاصل ہے نہ پہلے اجتہادات کو جو اب مٹ چکے ہیں۔ اصل چیز زندگی اور اس کی ضروریات ہیں۔[۴۲] غرضیکہ شیخ محمد عبدہؒ کے نزدیک سلف صالحین اعلام کے نام پر عقل انسانی کی جولان گاہ کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اسلاف ہی اسلام کی صحیح تشریح کر سکتے تھے اور بعد کی نسلوں کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ "رسالۃ التوحید" میں اسلاف پرستی کا ابطال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا: خدا کے عطیوں میں تمام نسلیں اگلی اور پچھلی برابر کی شریک ہیں۔ جہاں تک زمانے کے اعتبار سے سبقت کا سوال ہے تو یہ نہ تو علم کا ثبوت ہے اور نہ عقل و فکر کی برتری کا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نئی نسلوں کو سابقہ نسلوں پر فوقیت حاصل ہے اس لئے کہ معلومات کے جو ذرائع آج ہمیں حاصل ہیں ہمارے اسلاف ان سے محروم تھے۔[۴۳]

شیخ محمد عبدہؒ کبھی کبھی تقلید کی مذمت میں کافی شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ "شرح الدوانی" کے حاشیہ پر وہ تقلید کو کفر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ مقلد اصول دین کو عقل کے بغیر تسلیم کرتا ہے اس لئے اسے درجہ ایقان حاصل نہیں ہوتا اور جب تک اصول دین میں ایقان حاصل نہ ہو شک قائم رہتا ہے اور ایسا شخص کافر کہلانے کا مستحق ہے۔ انہوں نے کہا

---

[۳۹] تفسیر عم ۱۹۹

[۴۰] الدین هو حاسة عامة لكشف مايشتبه على العقل من وسائل السعادات و العقل هو صاحب السلطان فی معرفة تلك الحاسة : التوحید ۱۲۹۔

[۴۱] الاسلام والنصرانیة ۵۲ - ۵۳۔

[۴۲] و یجب ان تکون الکلمة الاخیرة للنصوص البالیة ولا للسلطات البائدة بل للحیاة النابضة ولروح التجدید وتوخی المصلحة العامة " التوحید ۱۵۸۔ [۴۳] التوحید ۱۵۸۔ "نہ تو نصوص فرسودہ کو حرف آخر سمجھا جا سکتا ہے نہ مردہ روایات کو۔ اصل چیز زندگی کی ابلتی ہوئی ضروریات اور مصلحت عامہ کے متغیر تقاضے ہیں" ظاہر ہے کہ نصوص سے مراد نصوص قرآنی نہیں کیونکہ وہ کبھی فرسودہ نہیں ہو سکتیں۔ ان سے لامحالہ مراد انسانوں کی وضع کردہ اسناد ہیں۔ طلوع اسلام

کو [۵۸] کافر وہ ہے جو حق کی روشنی دیکھتا ہے تو اپنی نظریں بند کر لیتا ہے اور جب صداقت کی آواز اس کے کانوں میں پہنچتی ہے تو اپنے کان بند کر لیتا ہے۔ وہ دلائل کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو تقلید میں مبتلا دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے اور ان کی طرح اسلاف کی اندھی تقلید میں لگ جاتا ہے [۵۹]۔ (جو عقیدہ یا مسلک قرآن کے خلاف ہو اس پر تقلیداً چمٹے رہنا کفر ہے۔ طلوع اسلام)

شیخ محمد عبدہؒ کے یہ افکار بہت ہی دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ فرانسیسی مصنف (LACOUTURE) محمد عبدہؒ کے ان افکار سے متاثر ہو کر لکھتا ہے، محمد عبدہؒ کی عقلیت پسندی اتنی ہی جوکھم والی (ADVENTUROUS) تھی جتنی کہ ان تمام مفکرین کی تھی جن میں سے بعضوں کو موت کا جام پینا پڑا [۶۰]۔

شیخ محمد عبدہؒ کا اصرار تھا کہ عقیدہ کی بنیاد "صحیح استدلال" پر قائم ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ لوگ (علماء) عقیدہ پہلے قائم کر لیتے ہیں پھر اس کے لئے "استدلال" ڈھونڈتے ہیں [۶۱]۔ اس کے علاوہ وہ "استدلال" یعنی فکر کی خود مختاری کے بہت زیادہ قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ استدلالی علوم فلسفہ اور منطق کی خاص طور پر حمایت کرتے تھے جب کہ علمائے ازہر کے نزدیک یہ علوم بے حد ناپسندیدہ تھے۔ غالباً جمال الدین افغانی پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے قیام مصر (۱۸۷۵ء) کے دوران میں ان علوم کے احیاء کی کوشش کی۔ انہوں نے سب سے پہلے ابن سینا کی "الاشارات" کا درس دینا شروع کیا جس کی وجہ سے مصر کے قدامت پسند علماء نے جمال الدین کو معتوب قرار دیا اور ان کے اس فعل کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا۔ شیخ محمد عبدہؒ نے ۱۸۷۷ء میں اپنے ایک مضمون میں علم منطق کی پر زور تائید کی اور کہا کہ یہ وہ علم ہے جو دلائل میں درستی پیدا کر سکتا ہے۔ انہوں نے

---

[۵۸] "قد اجمع اهل التحقیق من کل طائفة خصوصاً الشیخ الاشعری، ان المقلد فی اصول دینه لیس بمستیقن وکل من لیس بمستیقن فی الاصول فهو علی ریب فیها وکل من کان کذالک فهو کافر" سلیمان دنیا: الشیخ محمد عبده بین الفلاسفة والکلامیین، (مصر ۱۹۵۸) ۵۷۔ ہر گروہ کے اہل تحقیق اس بات پر متفق ہیں اور خصوصاً امام ابوالحسن اشعری نے تو صاف کہدیا ہے کہ مقلد کو اصول دین پر اطمینان قلب نہیں ہوتا وہ گویا وہ شک میں رہتا ہے اور جو بھی اصول دین کے معاملہ میں شک تذبذب کا شکار ہو وہ کافر ہے۔

[۵۹] الکافر المعاند الجامد الذی اذا رای ضیاء الحق اغمض عینیه واذا سمع الصوت من کلمة سد اذنیه ذلک الذی لا یبحث فی دلیل بعد عرضه علیه، ولا ینظر عن لحجة اذا اخترقت فؤاده، بل یدفع جمیع ذالک حباً فیما وجد نفسه فیه مع الکثیر ممن حوله واستمل فی التمسک به الی تقلید من سلفه" (المنار ۱: ۳۷)۔

[۶۰] EGYPT IN TRANSITION (ENG. TRANS), LONDON, 1958 P. 76

[۶۱] "واکثرهم یعتقد فیستدل، وقلما تجد بینهم من یستدل لیعتقد" (التوحید ۱۵) اکثر کی یہ حالت ہے کہ عقیدہ پہلے سے قائم کر لیتے ہیں اور پھر دلائل تلاش کرتے ہیں۔ دلائل دیکھ کر عقیدہ قائم کرنے والے بہت کم ہیں۔

علماء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اگر ہم اپنے فکر کو دلائل کی درستی کے لئے استعمال نہیں کرتے تو پھر ہم اسے اور کس مصرف کے لئے استعمال کریں گے[٩٩]۔ شیخ محمد عبدہٗ کے نزدیک فلسفہ اور منطق صداقت اور یقین کے حصول کے اہم ذریعہ ہیں۔ منطق کو وہ فکر کا "معیار" اور "میزان" سے تعبیر کرتے تھے[١٠٠]۔

عقلیت پسندی کے اسی جذبے کے تحت محمد عبدہٗ نے اپنے معاشرے کے جملہ نقائص پر سخت محاسبہ کیا۔ انہوں نے اپنے زمانے کے جھوٹے فقہا، علماء اور صوفیا کو بے نقاب کیا۔ اور بھولے بھالے عوام کو ان کے چنگل سے نکالنے کی پوری کوشش کی۔ فقہا کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان فقہا کی تاریخی حیثیت یہ رہی ہے کہ یہ ہر زمانے میں حکمران طبقے کے آلۂ کار بن کر ان کے مفاد کی ترجمانی کرتے رہے ہیں اور اس مقصد کے تحت "حیلۂ شرعیہ" کے نام پر شریعت کی من مانی تاویلیں کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح علماء کے طبقے کے ذہنی افلاس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کے اذہان تحقیق و تحمیص کی روح سے خالی ہیں اور ان پر ہر طرح کے اوہام و خرافات کا غلبہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عام مسلمانوں کے دماغوں میں تقلید کا زہر گھولتے رہے ہیں[١٠١]۔

ان علماء کا علمی سرمایہ اصل متون کی جگہ شرح و حواشی تک محدود ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اس زمانے کے نہیں ہیں بلکہ اس دنیا کے رہنے والے ہی نہیں ہیں[١٠٢]۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک تجربہ بیان کرتے ہوئے محمد عبدہٗ نے کہا کہ: جب ہم اپنے استاد کو پڑھاتے ہوئے سنتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی اجنبی زبان بول رہے ہیں[١٠٣]۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے لکھا: "ہمارے علماء کو جو قوم کے لئے بمنزلہ روح کے ہیں، آج تک علوم جدیدہ میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ اور وہ اب تک انہی مشاغل میں مصروف ہیں جو صرف پرانے اور متروک زمانے ہی کے لئے موزوں تھے۔ وہ اس حقیقت سے قطعاً غافل ہیں کہ ہم آج ایک نئی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں"۔ علوم حاضرہ کے متعلق ان علماء کا رویہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا کہ "علوم جدیدہ جو ہماری ضروریاتِ زندگی میں شامل ہیں اگر ان کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو یہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اگر یہ وحشی خانوں کا زمانہ ہوتا تو پھر بھی اس رویے کے حق بجانب ہونے کا کوئی عذر ہوتا۔ لیکن یہ ذہنیت آج کل کے زمانے میں کیوں کر چل سکے گی جب کہ علم پھیل رہا ہے اور دیگر متمدن ملکوں سے ہمارے روابط قائم ہیں[١٠٤]"۔

---

٩٩ رشید رضا: تاریخ ٢: ٦٠۔

١٠٠ ایضاً ١: ٣٦۔

١٠١ ایضاً ١: ٤٩٦، ٥٠٦ وغیرہ۔

١٠٢ رشید رضا: تاریخ ١: ٤١١۔

١٠٣ رسائل المنار ٨: ٣٨١۔

١٠٤ رشید رضا: تاریخ ٢: ٣٧ — ٤٤۔

علماء و فقہاء کی طرح شیخ محمد عبدہ نے اپنے زمانے کے صوفیوں کی بھی خبر لی۔ اگرچہ وہ خود ابتدائی دور میں صوفی تھے[۶۵] اور تاریخ اسلام میں صوفیوں کے رول کی تعریف کرتے تھے[۶۶] لیکن ان کے زمانے میں دنیائے اسلام میں نام نہاد صوفیوں کا جو کردار تھا اس سے وہ بہت نالاں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان صوفیوں نے مذہب کو حصولِ رزق کا ذریعہ بنا لیا ہے[۶۷] یہ لوگ عوام میں بے عملی اور توکلیت کی تلقین کرتے ہیں بھولے بھالے عوام بہت جلد ان کے فریب اور شعبدوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا تصور کرنے لگتے ہیں۔ قرآنی آیت ۲ : ۱۶۵ : " ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ والذین اٰمنوا اشد حباً للہ ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب ان القوۃ للہ جمیعاً وان اللہ شدید العذاب " کی تفسیر بیان کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہ نے بتایا کہ عقیدہ پیر پرستی لوگوں کو بے عملی میں مبتلا کرتا ہے اور ان کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا شعور ختم کر دیتا ہے۔ عوام اپنی حالت کے بہتر بنانے کے سلسلہ میں مادی وسائل پر بھروسہ کرنے اور اسباب و علل کو معلوم کرنے کی بجائے کسی ولی یا فقیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنہیں وہ کائنات پر متصرف سمجھتے ہیں۔ اس طرح مسلم عوام دین کے ساتھ ساتھ اپنی دنیا بھی تباہ کرتے ہیں[۶۸] ایک دوسرے موقع پر شیخ محمد عبدہ نے کہا کہ اولیاء کے متعلق اس طرح کے عقیدے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ہر حادثے کو جو دراصل خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور اسے کسی مردِ ولی یا ولی کا کرشمہ تصور کرنے لگتے ہیں۔ وہ غیر معمولی طبعی حوادث کو سمجھنے کی بجائے خوف سے کانپنے لگتے ہیں اور ہمیشہ انجانے خطرات سے ڈرتے رہتے ہیں[۶۹]

شیخ محمد عبدہ کے نزدیک ان سارے مفاسد اور برائیوں کا صرف ایک علاج ہے یعنی یہ کہ مسلمان قرونِ اولیٰ کی طرف واپس جائیں۔ انہیں جو اسلام ترکہ میں ملا تھا وہ صدیوں کے رطب و یابس کے جمع ہو جانے کی وجہ سے اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہو چکا تھا کہ اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ان کی کوشش تھی کہ اقل قلیل عقائد واضح کئے جائیں جن کے بغیر اسلام اسلام نہیں رہتا۔ انہیں ایسے بنیادی اسلامی عقائد کی ضرورت تھی جو پائیدار ہوں اور محض مقامی و عارضی خصوصیات نہ رکھتے ہوں اسی نقطۂ نظر سے وہ شریعت اسلامی میں ترمیم کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک برطانوی پادری کے جواب میں شیخ محمد عبدہ نے کہا کہ اگر اسلام کو

---

۶۵ رشید رضا : ۲ : ۲۰۰۔

۶۶ تفسیر المنار ۱ : ۲۱۷۔

۶۷ تاریخ ۲ : ۳۴۴۔

۶۸ تفسیر المنار ۲ : ۷۲۔

۶۹ رسالہ المنار ۶ : ۹۰۲۔

اس زاویہ نظر سے شیخ محمد عبدہؒ نے زندگی سے متعلق چند اہم شرعی مسائل کی جدید تشریح کی۔ انہوں نے سیونگ بینک کے سود کی اباحت کا فتویٰ دیا، تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو جائز ٹھہرایا۔ جہاں تک موخرالذکر مسئلہ کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ احادیث میں ان کی ممانعت کا حکم صراحتاً موجود ہے۔ مثلاً ایک حدیث ہے: "ان اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ المصورون۔" (قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب کے مستحق مصور ہوں گے) محمد عبدہؒ ان احادیث کی صحت سے انکار نہیں کرتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا جب بت پرستی رائج تھی۔ اب اس طرح کی کوئی مصلحت درپیش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تصویر کشی کے فوائد مسلم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا عارضہ کے زائل ہوتے اور فائدہ کے ظاہر ہونے کے بعد حکم ممانعت زائل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ذی روح اور غیر ذی روح اشیاء کی تصویر کشی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تصویر کشی ممنوع ہے اس لئے کہ اس سے بت پرستی کے پیدا ہونے کا امکان ہے اس کے جواب میں محمد عبدہؒ نے کہا ہے کہ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ چونکہ زبان سے جھوٹ کے سرزد ہونے کا امکان ہے اس لئے اسے باندھ دینا چاہیئے۔ حالانکہ انسان کی زبان سچ بولنے پر اسی طرح قادر ہے جس طرح جھوٹ بولنے پر۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ اسلامی شریعت کی روح کے خلاف ہے کہ وہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو ممنوع قرار دے، جب کہ یہ علم حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے[illegible]۔

اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں شیخ محمد عبدہؒ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جنسی مساوات کی طرف توجہ کی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اسلام جنسی مساوات کا قائل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ جہاں تک عملی زندگی کا سوال ہے عورتوں کو یہ حقوق اب تک بہت کم حاصل ہوئے ہیں[illegible]۔ اس مسئلہ پر شیخ محمد عبدہؒ نے اپنے خیالات کو زیادہ آگے نہیں بڑھایا۔ لیکن آزادیٔ نسواں کے سلسلے میں شیخ محمد عبدہؒ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تعدد ازدواج کے خلاف آواز اٹھائی جسے وہ غیر انسانی اور بہیمانہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام یک زوجگی کو مثالی نکاح سمجھتا ہے۔ انہوں نے قرآنی آیت: "فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ" کو بنیاد بناتے ہوئے کہا کہ تعدد ازدواج کے سلسلے میں عدل کی شرط ایک ایسی شرط ہے جس کا پورا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ [یہ دلیل صحیح نہیں۔ طلوع اسلام] انہوں نے مزید کہا کہ اوائل اسلام میں تعدد ازدواج کی جو اجازت تھی تو اس کے کئی فوائد تھے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے معاشرے کی شیرازہ بندی میں مدد ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں تعدد ازدواج سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں ان میں کسی قسم کی برائی نہیں [illegible] حال نہیں ہے۔ اس زمانہ میں تعدد زوجات کی برائیاں پوری طرح نمایاں ہو گئی ہیں اور یہ معاشرتی زندگی کی تباہی کا باعث ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس

[illegible] رشید رضا: تاریخ ۲: ۴۹۸۔

[illegible] رسالہ المنار ۱۲: ۲۳۱۔

اس کی سادہ ترین اور ابتدائی شکل میں لوٹایا جائے تو اسلام تمام ہی نوع انسان کے لئے قابل قبول ثابت ہو جائے گا۔ اور اس وقت یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ طلاق، تعدد ازدواج، غلامی اور اس قسم کے دیگر مسائل کے متعلق موجودہ اسلامی ضوابط اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ مسائل ہیں جن میں ضرورت پڑنے پر حالات کے تحت ضروری ترمیم کی جا سکتی ہے[۱]۔ ان کے نزدیک چونکہ شریعت کی اساس محبت، انصاف، اور مصلحت عامہ پر ہے اس لئے شریعت میں مسلسل تغیر کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ ہمیشہ مصلحت عامہ کے مطابق فیصلے صادر کرتے تھے اور بعض دفعہ انہیں سنت نبوی کی خلاف ورزی بھی کرنی پڑتی تھی[۲]۔ شیخ محمد عبدہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جہاں تک اجتماعی روابط اور شہری و تجارتی معاہدات کے متعلق قواعد و ضوابط کا تعلق ہے ان کو مذہب سے کاملاً علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ اور انہیں کسی ایسے ضابطے کا لازمی جزو نہیں بنا دینا چاہیئے جو مقدس اور ناقابل تغیر قرار دیا گیا ہو۔ یہ قوانین بلاشبہ قرآن اور سنت پر مبنی ہونے چاہئیں۔ لیکن ان میں ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیلی کی گنجائش ہونی چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ قوانین انسانی مصلحت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اور مصلحت زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے[۳]۔ اسی مقصد کے تحت شیخ محمد عبدہؒ قرآن و حدیث کے نصوص کی خلاف ورزی کو بھی جائز سمجھتے ہیں[۴]۔ (یہاں صاحب مقالہ کو غالباً غلط فہمی ہوئی ہے۔ (طلوع اسلام)]۔

ان کے نزدیک شریعت کی تفصیلات کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اصل چیز ان کی روح ہے[۵]۔ انہوں نے کہا: "حاجت" بمنزلہ ضرورت کے ہے اور ضرورت" اسے متفق علیہ بنا دیتی ہے[۶]۔

---

[۱] ... ان امثال ھذہ المسائل [کالطلاق وتعدد الزوجات والرق] لا یعدھا المسلمون من اصول الدین" تاریخ ۲: ۵۸۴۔ مثلاً طلاق، تعدد ازدواج اور غلامی وغیرہ۔ انہیں مسلمان اصول دین نہیں قرار دیتے۔

[۲] رسالہ المنار ۳: ۲۱۵۔ [۳] رسالہ المنار ۴: "ان الاحکام العملیۃ: تتریخ لمصلحۃ البشر والمصلحۃ تختلف باختلاف الزمن" ... المنار ۱۳: ۸۶۲

[۴] "ان الشریعۃ الاسلامیۃ بما تقرر فیہا من قاعدتی الاجتہاد ورعایۃ الاصلح، کانت من الشرائع التی توافق کل زمان ومکان وتجیز لکل فرد حکما یوافق مقتضی المصلحۃ للحال وان خالف النص ..." المنار ۱۳: ۴۴۔ شریعت اسلامی جس میں تجدید و اجتہاد اور قومی مصالح کی پوری طرح رعایت رکھی گئی ہے ان شریعتوں میں سے ہے جو زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہیں۔ اور ہر زمانے میں ہر قسم کے حالات کے موافق ہو سکتی ہیں مصلحت وقت کی ان میں اس قدر رعایت رکھی گئی ہے کہ تقاضائے وقت کے مطابق وقتی طور پر وہ چیزیں بھی جائز ہو سکتی ہیں جو اگرچہ نص کے خلاف ہوں۔ (جن چیزوں کو نص قرآنی نے مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے وہ جائز نہیں ہو سکتیں۔ طلوع اسلام)

[۵] رشید رضا: تاریخ ۲: ۹۴۸

[۶] دیکھئے تفسیر المنار وغیرہ۔

مسئلے پر نظر ثانی کی جائے[۵۹]۔ شیخ محمد عبدہ نے علمائے اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اسلام انسان کی بھلائی کیلئے آیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کی اس طبیعت کے تقاضے کے تحت اس بیہودہ رواج پر پابندی عائد کی جائے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اصولی شکل میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب کسی شے سے مفاسد پیدا ہونے لگیں جو اس سے پہلے نہیں پیدا ہوئے تھے تو ایسی حالت میں واجب ہو جاتا ہے کہ اس شے کی بابت حکم میں تبدیلی کی جائے اور اسے حالات حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے اس لئے کہ یہ مسلم قاعدہ ہے کہ مفاسد کی روک تھام حصول مصالح پر مقدم ہے[۶۰]۔

شیخ محمد عبدہؒ کے ان افکار نے مصر میں تحریک نسواں کے نشو و ارتقا کے لئے زمین ہموار کی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصر میں تحریک نسواں کے سب سے بڑے علمبردار قاسم امین[۶۱] (۱۸۶۵ء – ۱۹۰۸ء) محمد عبدہؒ کے شاگرد تھے۔

اگر چہ آج شیخ محمد عبدہؒ کے بعض افکار بے رنگ معلوم ہوتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جس آزادانہ طریقے سے اسلامی شریعت کی تشریح فرمائی وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے یقیناً ترقی پسندانہ ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مصر کے علمائے جامد کس شدومد سے شیخ محمد عبدہؒ کے ان ہی افکار کی مخالفت میں کمربستہ رہتے تھے۔ جو آج ہمیں پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض تاریخی اسباب کی بنا پر محمد عبدہؒ کی اصلاحی تحریک پروٹسٹنٹزم (PROTESTENTISM) کی شکل اختیار نہیں کر سکی۔ پھر بھی ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلم معاشرے میں لبرل اور اصلاحی رجحانات کو پروان چڑھایا جو نتیجے کے اعتبار سے معاشرے کو روایت پرستی کی گرفت سے نکالنے کی جانب ایک ضروری قدم تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسلم معاشرے میں ازمنۂ وسطیٰ کی فرسودہ قدروں کی جگہ انسان دوستی (HUMANISM) کی روایات کو فروغ دینے کی کوشش کی اور لوگوں کو عقل پر اعتماد کرنا سکھایا۔ ان کی تعلیمات کے زیر اثر مصر میں تاریخی شعور کو پنپنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ مسلم دانش وروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے شیخ محمد عبدہؒ کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان دانش وروں میں قاسم امین، علی عبدالرازق اور طٰہٰ حسین وغیرہ کے نام کافی مشہور ہیں۔ لیکن علمائے ازہر عموماً شیخ محمد عبدہؒ کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان لوگوں نے انہیں سلف کا دشمن قرار دیا۔ کافر کہا اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو ان کے خلاف بھڑکایا۔ یہ لوگ نہ صرف ان کی اصلاح پسندی کے دشمن تھے بلکہ وہ ان کے جوتوں کی وضع اور بالوں کی تراش

---

[۵۹] تفسیر المنار ۴: ۳۴۸ – ۳۴۹

[۶۰] "فاذا ترتب علی شیئ مفسدۃ فی زمن لم تکن تلحقہ، فلا شک فی وجوب تغییر الحکم وتطبیقہ علی مقتضیات الحال الحاضرۃ، جریا علی قاعدۃ "درء الفساد مقدم علی جلب المصالح"۔ ایضاً ۴: ۳۵۰

[۶۱] آزادی نسواں پر قاسم امین نے دو اہم کتابیں لکھیں "تحریر المرأۃ" اور "المرأۃ الجدیدۃ"۔ یہ دونوں کتابیں مصر سے علی الترتیب ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئیں۔

پر بھی معترض تھے۔ جیسا کہ قاسم امین نے کہا ہے۔ ان میں سے اکثر یوں اعتراض کرتے تھے: یہ کیسا شیخ ہے جو فرانسیسی زبان میں باتیں کرتا ہے: یورپ کا سفر کرتا ہے: علمائے فرنگ کی تحریروں کا ترجمہ کرتا ہے۔ ایسے فتوے دیتا ہے جو اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں دیئے۔ خلفیہ امدادی انجمنوں میں حصہ لیتا ہے۔ نیز بادہ مساکین کے لئے چندے جمع کرتا ہے۔ اگر یہ شخص اہلِ دین میں سے ہے تو اس کی جولانگاہ مسجد سے گھر تک ہونی چاہیئے۔ اگر وہ دنیا دار لوگوں میں سے ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس میدان میں تنہا سب سے زیادہ معروفِ عمل ہے۔[۳۳]

مختصر یہ کہ شیخ محمد عبدہؒ کو سب سے زیادہ خطرہ مصر کے ان ہی علمائے سوء سے تھا جو ہر طرح کی روشن خیالی کے دشمن تھے اور جن کے خلاف شیخ محمد عبدہؒ کو ساری عمر جہاد کرنا پڑا۔ جب وہ بسترِ مرگ پر تھے تو انہوں نے ان ناعاقبت اندیش علماء کے خلاف اپنے خدشات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔[۳۴]

ولست أبالي أن يقال محمدٌ ... أبلّ أم اكتظت عليه المآتم

ولكنه دين أردت صلاحه ... أحاذر أن تقضي عليه العمائم

مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ میری موت کے بعد کہا جائے کہ محمد عبدہؒ جلیل القدر تھا یا نہیں۔ نہ ہی مجھے اس کی پروا ہے کہ میری موت کے بعد ماتم کرنے والوں کا مجمع ہوگا یا نہیں۔ مجھے اگر کوئی فکر ہے تو اس دین کی جسے میں نے جاہلی تصورات سے صاف کیا تھا اور یہی ڈرتا ہوں کہ میری موت کے بعد دین حاملانِ جبہ و عمامہ کے رحم و کرم پر ہوگا۔

قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں جیسے اہم عنوانات

پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو مدت سے نایاب تھی۔ اس کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ اب اسے مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد "سستے ایڈیشن" کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی ہے۔ جلد فرمائش بھیج دیجئے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ — ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

۳۳ تاریخ ۲ : ۲۶۸

۳۴ ایضاً ۱ : ۱۰۲۶

زندگی کا لنگر

(محترم عبدالرب صاحب)

انسانی زندگی کی مثال کشتی کی سی ہے۔ بپھرے ہوئے پانی میں بطخ کی مانند سیدھی تیرے گی۔ پانی میں سکون نہ ہو تو ہوا کے جھونکے اور موجوں کے تھپیڑے جدھر چاہیں اسے لے جائیں گے۔ لنگر کے بغیر کشتی کو قرار نہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیت انسان کی ہے۔ اسے آزاد چھوڑ دو تو کوئی بتا نہیں سکتا کہ وہ کدھر جائے گا اور کہاں ٹھہرے گا۔ مکھی کی مانند نہ اس کی کوئی خاص سمت ہوگی نہ جائے قرار۔ کاغذ کے پرزے کی طرح ہوا کا جھونکا اسے اڑائے پھرے گا۔

لیکن زندگی کی ہوا فضائے آسمانی کی بجائے سینوں میں چلتی ہے اور آندھی کی طرح دل و دماغ کو لپیٹ میں لے۔ انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے وہ خون پسینہ ایک کرتا رہتا ہے مگر بکھرے ہوئے دانوں کو سمیٹ نہیں سکتا۔ "ان سعیکم لشتی" (۹۲/۴) اس کی زندگی میں لنگر نہیں ہے۔

انسان کی دن رات کی ساتھی اور رہنما عقل ہے لیکن عقل کو انفرادی نفع کمانے اور اپنے فائدوں کی جستجو سے کب فرصت ہے۔ لنگر ڈھونڈے تو کون؟

جس نے جان دی تھی آخر اسی نے بتایا کہ انسانی زندگی کا لنگر ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یعنی اللہ کے دیئے ہوئے ہمیشہ رہنے والے زندگی کے وہ بنیادی اصول جنہیں اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم میں لکھوا کر امت کو سونپا اور جن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے۔

قرآنی اصولوں میں سے ایک کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی "انسان کا جائز حق اس کی محنت کا بدلہ ہے" یہ اصول ہوا زندگی کے لنگر کی ایک شاخ۔ لنگر کی ایک اور شاخ ہے "تکریم انسانیت"۔ "ولقد کرمنا بنی آدم" (۱۷/۷۰)

ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم بنایا ہے یعنی تکریم میں انسانوں میں تمیز نہیں کی جا سکتی۔ ہر انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے قابل عزت ہے۔ کالا ہو یا گورا۔ امیر ہو یا غریب۔ مٹی سی لت پت مزدور ہو یا صاف ستھرا پیشہ ور۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ہو یا قیمتی لباس میں۔ نحیف و نزار ہو یا تنومند۔ ہم مذہب ہو

یا غیر مذہب والا۔ غرض ہاتھ، پیر، آنکھ، کان، ناک والا ہر انسان عزت کے سلوک کا مستحق ہے۔ سامنے آئے ہوئے ہر انسان کو سلام کرنا طبیعت پر بار ہو سکتا ہے لیکن یہ ہچکچاہٹ (جو بہرحال ہے تکریم کے خلاف) کوشش سے دور کی جا سکتی ہے۔ ورنہ ہوگی تو تکریم کے ساتھ دوسروں کو ذلیل سمجھنے کا جذبہ بھی دل میں جگہ پائے گا۔ اور زندگی دو رُخی ہو جائے گی۔ جس سے ہمارا کام ہوا اس کی عزت کی اور جس کا ہم سے کام ہوا اسے دھتکار دیا۔ خود بھی لرزا گئے اور دوسروں کو بھی ہراساں کیا۔

تکریم، انسان کو باہمت اور حوصلہ مند بناتی ہے کرنے والے کو بھی اور عزت پانے والے کو بھی۔ ہمت اور حوصلہ وہ چیز ہے جو جیتے جی انسان کو بلند رکھتی ہے اور جو موت کے بعد اس کی ذات کو زندگی کے اگلے مرحلے طے کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یعنی جنتی زندگی کا وارث۔ تکریم سے دنیا کی زندگی بھی جنتی بن سکتی ہے بشرطیکہ تکریم کو انسانی برادری کی تعمیر کی بنیاد بنایا جائے۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ (۲/۲۰۱) مگر یہ حسین آرزو پیدائشی مسلمان کے منہ سے اس وقت بھلی لگے گی جب وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا عہد پکا کرے۔

اور اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے ہر وقت اس کا دھیان رکھے۔ یعنی اپنے ہر فیصلہ اور ہر کام میں پہلے یہ دیکھے کہ وہ قرآن کریم کی کسی ہدایت سے تو نہیں ٹکراتا۔ قرآن کریم نے اس عہد کو اللہ کا عہد کہا ہے اور اسے پورا کرنے کی ہدایت کی ہے "وبعہد اللہ اوفوا" (۶/۱۵۳) اس عہد کو توڑنے والے فاسق اور ٹوٹا پانے والے ہیں (۲/۲۷) پیدائشی مسلمانوں کی موجودہ پستی وہ نقصان ہے جو عہد اللہ کے توڑنے کی پاداش میں ان کے حصہ میں آیا ہے۔

تکریم کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ عزت کے سلوک کے ساتھ ساتھ تکریم کرنے والا واضح طور پر یہ بھی سمجھے کہ جس طرح وہ اپنی مرضی آزادانہ استعمال کرنا چاہتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کو بھی اپنی مرضی آزادانہ استعمال کرنے سے نہ روکے اور اپنی مرضی کو ان پر ہرگز نہ ٹھونسے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مرضی جس کسی کی بھی ہو وہ قرآن کریم کی مقرر کردہ حدود سے نہ بڑھے۔

تکریم کے سلسلے میں اتنی بات اور یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان کی بنیادی تکریم کے بعد معاشرہ میں مختلف افراد کی عزت ان کے اعمال اور کردار کی رو سے متعین ہو گی اور سب سے زیادہ عزت کا مستحق وہ ہو گا جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہو گا۔

کراچی کے دوستو!

آیئے اور ہر اتوار کی صبح کو سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کی زبان میں سنیئے کہ قرآن عصرِ حاضر کے چیلنج کا علیٰ وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے۔ اور زندگی کے درپیش اور بکھرے ہوئے مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے۔

رابطۂ باہمی

لاہور بزمِ سرگرمِ عمل ہے ۲۵؍ دسمبر کو یومِ قائدِ اعظمؒ کی تقریب پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں خان عبدالوحید خاں وزیرِ اصلاحات کی صدارت میں پرویز صاحب کی تقریر کا اہتمام کیا گیا۔ دعوتی کارڈوں سے داخلہ کے باوجود اس اجتماعِ خصوصی کی حاضری اپنی مثال آپ تھی۔ وزیرِ موصوف نے اپنی تعارفی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں پرویز صاحب کی گراں قدر خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ان فکری ذہنی کاوشوں کی تعریف کی جو وہ اپنی قرآنی دعوت کے سلسلے میں سالہا سال سے بروئے کار لا رہے ہیں۔ "قائدِ اعظمؒ کا پاکستان" پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے قائدِ اعظمؒ کے مقصود و منتہا کو جس قابلِ اعتماد اور دلنشین انداز سے پیش کیا وہ انہی کا حصہ ہے (یہ خطاب اسی اشاعت میں شامل ہے)۔ بصیرت افروز خطاب اور آخر میں پرویز صاحب کی زبان سے پیش آمدہ اہم سوالات کے نکھرے نکھرے جوابات پورے ہال میں وجد کی سی کیفیت چھا گئی۔

۲۰؍ جنوری کو اسی ہال میں پرویز صاحب کی ایک اور تقریر کا انتظام کیا گیا۔ شیخ سراج الحق صاحب کی صدارت میں پرویز صاحب نے "نظام تہذیب نہیں سکتا" کے موضوع پر خطاب کیا۔ یہ بھی ایک خصوصی اجتماع تھا۔ جس میں دعوتی کارڈوں کے ذریعے داخلہ تھا۔ اس پابندی کے باوجود ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شہر کے اصحابِ علم و فکر اس اجلاس میں شریک تھے اور مفکرِ قرآن کی قرآنی حقائق و معارف سے بھرپور تقریر اس فضا میں علم و بصیرت کی کرنیں پھیلا رہی تھی۔ پرویز صاحب نے ظلم کا قرآنی مفہوم واضح کیا اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ظلم کے مختلف گوشوں سے نقاب اٹھتے چلے گئے۔ اُممِ سابقہ کی قرآنی مثالوں سے انہوں نے اس حقیقت کو پوری طرح واشگاف کیا کہ [illegible] اور موت و حیات کی ساری داستانیں ظلم اور عدل و احسان کے محوروں میں گردش کر رہی ہیں۔ ظلم ہر معاشرے [illegible] کا سامان بنتا ہے اور عدل و احسان [illegible] گفتار کا۔ سوالات اور ان کے جوابات کا مرحلہ پورے خطاب کے لئے حرفِ آخر کا دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ [illegible] مزید نکھر سامنے آ گئے۔ [illegible] کے مطابق عدل کا نظام نہ مغرب کی جمہوریت پیش کر سکتی ہے نہ روس کی آمریت۔ یہ نظام صرف قرآن کریم کی رو سے قائم [illegible]

بزم آئندہ کے لئے بھی شہر میں خطابات کا یہ سلسلہ بروئے کار لانے کا عزم رکھتی ہے اور اس کے لئے پرویز صاحب سے درخواست

کی جا رہی ہے۔

لندن

بزم کا ماہانہ اجلاس چغتائی صاحب کے دولت کدہ ( ) پر منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی حاضری سابقہ اجتماعات کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ کئی ایک خواتین بھی شریک اجلاس تھیں۔ "مردوں سے زندہ انسانوں کا تعلق" کے موضوع پر پرویز صاحب کی تقریر کا ٹیپ سنایا گیا اور اس کے بعد حاضرین کے برملا اعتراف کیا کہ پرویز صاحب کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا پول پوری طرح کھل گیا۔ بہت سے نئے احباب نے بڑے ذوق و شوق سے اجلاس ہائے آئندہ کے لئے اپنے نام برائے شرکت پیش کئے۔

بزم نے یہ اہتمام کیا ہے کہ انگلستان کے دیگر بڑے بڑے شہروں میں بھی پرویز صاحب کی تقریروں کے ٹیپ سنائے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کا آغاز ہو گیا ہے اور یہ حسن آغاز سب کے لئے وجہ مسرت ہو گا۔ محترم ایم۔ دائی بٹ صاحب نے جیسے اہم صنعتی شہر میں پرویز صاحب کے درس قرآن کا ٹیپ پہلی بار پاکستانی احباب کے اجتماع میں سنایا اور ان کی رپورٹ ہے کہ "خدا گواہ ہے کہ حاضرین حسن خطابت سے وجد میں آ گئے اور عش عش کر اٹھے"۔ بٹ صاحب نے یہی ٹیپ ایک اور شہر ڈیوبری ( ) میں بھی سنایا اور وہاں بھی یہی کیفیت تھی۔

محترم دین محمد صاحب نے جو بزم کے سرگرم معاون ہیں۔ بریڈفورڈ جیسے مشہور صنعتی شہر میں پاکستانی احباب کو ٹیپ سنانے کا اہتمام کیا اور حاضرین کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ ایک آئیڈیل ہے جو یہاں کے پاکستانیوں کو نصیب ہوئی اور دین خداوندی سے متعلق اس جامع تعلیم کا سلسلہ حسین برابر جاری رہنا چاہیئے۔ بزم لندن نے بریڈفورڈ اور دیگر شہروں کے احباب کو یقین دلایا ہے کہ نئے ٹیپ موصول ہوتے ہی ان کی آرزو پوری کی جائے گی۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

کراچی

میں درس کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے اور اس اجتماعات کی رونق میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شہر کے دور دراز گوشوں تک آواز پہنچ رہی ہے اور جدید حلقہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔

جہلم کے بھائیو! آیئے اور ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو
بوقت ۵ بجے شام ڈاکٹر حفیق مرزا کے دولتکدہ
پر پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ سنئے۔